۱۹۴۴ء

دیال پریس، دہلی

# فہرست مضامین


| | | | |
|---|---|---|---|
| ۱ | | انتساب | ۵ |
| ۲ | باب ۱ | حکومت کی اقسام | ۹ |
| ۳ | باب ۲ | خاندانی بادشاہتیں | ۱۱ |
| ۴ | باب ۳ | غیر خالص حکومتیں | ۱۳ |
| ۵ | باب ۴ | دارا کی ریاست جسے سکندر نے فتح کیا | ۲۴ |
| ۶ | باب ۵ | ایسے شہروں اور ریاستوں پر جو فتح ہونے سے پہلے | ۳۱ |
| ۷ | باب ۶ | ان بادشاہتوں کے بارے میں | ۴۵ |
| ۸ | باب ۷ | نئی بادشاہتیں | ۵۳ |
| ۹ | باب ۸ | ان اشخاص کے بارے میں | ۶۱ |
| ۱۰ | باب ۹ | قومی بادشاہت | ۸۱ |
| ۱۱ | باب ۱۰ | مختلف بادشاہتوں کی طاقت | ۸۹ |
| ۱۲ | باب ۱۱ | مذہبی بادشاہتیں | ۹۳ |

| | | | |
|---|---|---|---|
| ۱۳ | باب ۱۲ | سپاہ کی اقسام | ۱۰۰ |
| ۱۴ | باب ۱۳ | امدادی مخلوط اور قومی سپاہ | ۱۱۲ |
| ۱۵ | باب ۱۴ | بادشاہ کے جنگی فرائض | ۱۲۲ |
| ۱۶ | باب ۱۵ | وہ خصائل جن کی بنا پر لوگوں ... | ۱۲۸ |
| ۱۷ | باب ۱۶ | کشادہ دستی اور کنجوسی | ۱۳۲ |
| ۱۸ | باب ۱۷ | سنگ دلی اور رحم دلی | ۱۳۶ |
| ۱۹ | باب ۱۸ | بادشاہتیں اور وفائی عہد | ۱۴۵ |
| ۲۰ | باب ۱۹ | اپنے آپ کو حقارت و نفرت سے بچانے کا بیان | ۱۵۲ |
| ۲۱ | باب ۲۰ | قلعے اور اسی قسم کی دوسری چیزیں | ۱۶۷ |
| ۲۲ | باب ۲۱ | بادشاہ ناموری کیونکر حاصل کر سکتا ہے | ۱۸۳ |
| ۲۳ | باب ۲۲ | بادشاہوں کے معتمد | ۱۹۱ |
| ۲۴ | باب ۲۳ | چاپلوسوں کو پاس نہ پھٹکنے دو | ۱۹۲ |
| ۲۵ | باب ۲۴ | شاہان اطالیہ اپنی ریاستیں کیوں کھو بیٹھے | ۱۹۹ |
| ۲۶ | باب ۲۵ | انسانی معاملات میں قسمت کو کتنا دخل ہے | ۲۰۳ |
| ۲۷ | باب ۲۶ | اطالیہ کو وحشیوں سے آزاد کراؤ | ۲۱۰ |

## نکولو میکیاویلی کی جانب سے عالی جاہ لورنزو[1] دی پیرو دے میدیچی کے نام

جو لوگ بادشاہوں کی خوشنودی حاصل کرنا چاہتے ہیں وہ عام طور پر ان کے پاس ایسے تحفے تحائف لے کر حاضر ہوتے ہیں جن کی بادشاہوں کی نظر میں قدر ہو یا جن سے ان کو خوشی حاصل ہو۔ چنانچہ بادشاہوں کو اکثر ان کے شایانِ شان نذرانے دئے جاتے ہیں مثلاً گھوڑے، اسلحہ، زری کے کپڑے، جواہرات اور زیورات۔

میری بھی یہ تمنا ہے کہ اپنے خلوص کی نشانی لے کر

---

[1] سال پیدائش ۱۴۹۲ء و سال وفات ۱۵۱۹ء۔ ۱۵۱۳ء سے فلورنس کا حاکم تھا

حضور والا کی خدمت میں حاضر ہوں۔ مگر میں اپنے سارے ساز و سامان پر نظر دوڑاتا ہوں تو اس میں مجھے (کم از کم اپنے خیال میں) ایک چیز سب سے زیادہ قیمتی دکھائی دیتی ہے۔ میری مراد ہے اس علم سے جو مشاہیر کے طرز عمل اور کارناموں سے متعلق ہے۔ یہ علم میں نے جدید معاملات سے پرانے تعلق اور قدیم معاملات کے مسلسل مطالعہ کے ذریعہ حاصل کیا ہے۔ بہت دنوں کی محنت اور غور و فکر کا نچوڑ یہ چھوٹی سی کتاب ہے جسے حضور والا کو نذر کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔

گو میں اس تصنیف کو آپ کی خدمت میں پیش کرنے کے قابل نہیں سمجھتا مگر مجھے آپ کی غریب نوازی پر بڑا بھروسہ ہے۔ گر قبول افتد زہے عز و شرف۔ اس سے زیادہ میری بساط نہیں کہ کئی سال کی کوشش، انتہائی محنت اور طرح طرح کے خطروں کا مقابلہ کر کے میں نے جو علم حاصل کیا ہے اس کا لب لباب اس طرح آپ کے سامنے پیش کر دوں کہ تھوڑے سے وقت میں آپ کے ذہن نشین ہو جائے۔ میں نے یہ کوشش نہیں کی ہے کہ اسے خوبصورت الفاظ یا خطیبانہ کلمات اور دوسری ظاہری خوبیوں سے سجاؤں جو اس قسم کی

تصانیف میں اکثر ہوتی ہیں۔ مجھے یہ قبول ہے کہ اس کتاب کی مدح و ثنا سرے سے نہ ہو لیکن اگر ہو تو اس وجہ سے ہو کہ اس میں سچائی اور وزن ہے۔
مجھ جیسے حقیر و ناچیز شخص کی یہ کوشش کہ نہ صرف بادشاہوں کے متعلق کچھ لکھوں بلکہ ان کے لئے دستور عمل متعین کروں ممکن ہے آپ کی نظر میں کھٹکے۔ مگر آپ یہ نہ سمجھیں کہ میں اپنے متعلق کسی مغالطہ میں مبتلا ہوں بلکہ یوں خیال کریں کہ جو کوئی کسی سرزمین کی تصویر بنانا چاہتا ہے تو پہاڑوں اور بلند مقامات کو سامنے رکھنے کے لئے میدانوں میں اتر آتا ہے اور نیچے وادی کو سامنے رکھنا چاہتا ہے تو پہاڑوں اور ٹیلوں کا رُخ کرتا ہے۔ اسی طرح رعایا کو سمجھنے کے لئے بادشاہ ہونا اور بادشاہوں کو جاننے کے لئے رعایا میں سے ہونا ضروری ہے۔
میری التجا ہے کہ حضور والا اس کتاب کو اسی جذبۂ محبت کے ساتھ قبول فرمائیں جس جذبہ کے ساتھ یہ پیش کی جا رہی ہے۔ جب آپ اس کے مضامین پر غور و فکر فرمائیں گے تو آپ کو خود میری دلی خواہش کا اندازہ ہو جائے گا۔ میں بس یہ چاہتا ہوں کہ حضور والا

کا مرتبہ بلند ہو۔ آپ ماشاء اللہ صاحب تقدیر بھی ہیں اور
صاحب قابلیت بھی۔ حضور والا اپنی عظمت کی اونچائیوں
سے کبھی نیچے کی دنیا پر نظر ڈالیں گے تو آپ کو خود معلوم
ہو جائے گا کہ بندہ کس بری طرح قسمت کی گردش کا شکار
ہے پھر بلا وجہ ادریہم[1]

---

[1] ۱۸۵۸ء میں جب سیدی خاندان کو دوبارہ حکومت ملی تو کیا دیلی کی پہنچے تو
وزیر بنتی اور فروری ۱۸۶۱ء میں سیدی حکومت کے خلاف سازش کے
الزام میں گرفتار ہوا گو بعد میں جب الزام ثابت نہ ہو پایا تو رہا کر دیا گیا۔

# باب ۱

## حکومت کی اقسام اور وہ طریقے جن سے وہ معرض وجود میں آتی ہیں

چاہے تاریخ پر نظر دوڑائیے اور چاہے آج کی دنیا پر۔ جب کبھی آپ آدمی کو آدمی پر حکومت کرتے ہوئے دیکھیں گے تو یہ حکومت یا تو جمہوری طرز کی حکومت ہوگی یا بادشاہت۔ بادشاہی حکومتیں موروثی ہوتی ہیں جو باپ دادا سے ورثہ میں چلی آتی ہیں یا نئی ہوتی ہیں۔ پھر نئی بادشاہت کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جو نئے سرے سے قائم ہو جیسے فرانسس اسفورزا[1] کی حکومت مائلان پر۔ دوسری صورت یہ ہے کہ کوئی

---

[1] سنہ ۱۴۰۱ء تا سنہ ۱۴۶۶ء۔ کرائے کے سپاہیوں کے مشہور لیڈر کا بیٹا اور مائلان کے نواب فلپو ماریا کا داماد پہلے تو اہل وینس کی طرف سے سپہ سالار بنا مگر پھر ان سے ان بن ہو گئی اور وہ مائلان کا حاکم بن گیا۔

ریاست مغلوب ہو کر کسی پرانی ریاست کا جزو بن جائے جس طرح نیپلس کی ریاست ہسپانیہ کا جزو بن گئی[1]۔ ایسے علاقے نئی ریاست میں شامل ہونے سے پہلے یا تو کسی بادشاہ کے ماتحت رہے ہوں گے یا آزاد۔ انہیں زیر کرنے کے لئے کبھی بادشاہ خود اپنی قوت استعمال کرتا ہے اور کبھی دوسروں کی۔ پھر اس کام میں کبھی تقدیر اس کا ساتھ دیتی ہے اور کبھی اس کی اپنی کوشش کو اس میں دخل ہوتا ہے۔

---

[1] بذریعہ فرڈی نینڈ، سنہ ۱۵۰۱ء

# باب ۲

## خاندانی بادشاہتیں

اس وقت میں جمہوریتوں کا ذکر نہیں کرتا۔ کسی دوسری جگہ[1] میں نے ان پر تفصیل سے اظہار خیال کیا ہے۔ یہاں پر میں صرف بادشاہتوں کے متعلق لکھنا چاہتا ہوں۔ سوال یہ ہے کہ میں نے ایسی شاہی حکومتوں کی جو تقسیم کی ہے اس کے مطابق ان پر کیونکر حکومت کی جائے اور انھیں کیسے برقرار رکھا جائے۔ میرا دعویٰ ہے کہ نئی حکومتوں کی نسبت موروثی حکومتوں کو چلانا زیادہ آسان ہے۔ وجہ یہ ہے کہ لوگ ایک خاص خاندان کی حکومت کے عادی ہو جاتے ہیں۔ موروثی بادشاہ کے لئے بس اتنا ضروری ہے کہ وہ اپنے آباؤ اجداد کے نقش قدم پر چلے اور جب کوئی نئے واقعات پیش آئیں تو ان کا لحاظ کرے

---

[1] Discorsi sopra la prima decade di Tito Livio. کتاب کا نام ہے جس کی پہلی جلد ۱۵۱۳ء میں تصنیف ہوئی۔

بادشاہ لائق ہوگا تو ضرور اپنا تخت سنبھال سکے گا۔ البتہ یہ اور بات ہے کہ کوئی دوسرا غیر معمولی قابلیت کا انسان اس کے تخت پر قابض ہو جائے۔ لیکن اس صورت میں بھی جب بھی غاصب پر وقت پڑے گا تو اسے پھر اپنی کھوئی ہوئی طاقت حاصل کرنے کا موقع ہوگا۔ اطالیہ میں اس کی ایک مثال ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔ ڈیوک آف فرارا[1] جو پہلے ۱۴۸۴ء میں اہل وینس کے حملہ کو روکنے کے لیے نہایت زور شور سے لڑا اور پھر جس نے ۱۵۱۰ء میں پوپ جولیس کے خلاف جنگ کی۔ اور یہ سب اس سبب سے کہ اس کا اس حکومت سے پرانا تعلق تھا۔ موروثی بادشاہ کے لئے اپنی رعایا کو ستانے کے نہ تو بہت مواقع ہوتے ہیں اور نہ ضرورت لہٰذا وہ ہر دلعزیز ہوتا ہے اور لوگ اس سے محبت کرتے ہیں۔ یہ بات اور ہے کہ اس میں غیر معمولی عیوب ہوں جن کی وجہ سے لوگ اس سے نفرت کرنے لگیں۔ ایسی بادشاہت کی قدامت اور تسلسل کی وجہ سے تمام تبدیلیوں کے اسباب اور ان کی یاد دل سے فراموش ہو جاتی ہے۔ عمارتوں کی طرح حکومت میں بھی ایک تبدیلی سے دوسری تبدیلی کی گنجائش نکلتی ہے۔

---

[1] مراد دو مختلف [illegible] ہیں جو دونوں فرارا کے ڈیوک تھے۔ ایک ارکول [illegible] ۱۴۷۱ء تا ۱۵۰۵ء جسے [illegible] کے ساتھ ۱۴۸۴ء [illegible] جنگ جاری رکھنی پڑی۔ اور دوسرا الفانسو ۱۵۰۵ء تا ۱۵۳۴ء [illegible] پوپ جولیس دوم کا دو سال تک ۱۵۱۰ء تا ۱۵۱۲ء مقابلہ کیا۔

# باب ۳

## غیر خالص حکومتیں

دقتیں پیش آتی ہیں حال کی حاصل کی ہوئی حکومتوں میں۔ خصوصاً جب یہ حکومتیں بالکل نئی نہ ہوں بلکہ غاصب کے علاقے میں شامل کر لی گئی ہوں۔ اس طرح کی حکومت کو غیر خالص حکومت کہا جاتا ہے۔ ایسی بادشاہتوں میں گڑبڑ اور انقلابوں کا سبب وہ قدرتی پیچیدگیاں اور مشکلات ہوتی ہیں جو نئی فتوحات کے لوازم میں سے ہیں۔ اکثر یہ ہوتا ہے کہ رعایا اپنے بادشاہ کا اپنی بہتری کی امید میں ساتھ چھوڑتی ہے۔ یہی امید اسے بغاوت پر آمادہ کرتی ہے۔ مگر عموماً اس کا اندازہ غلط ثابت ہوتا ہے اور تجربہ سے اُسے پتہ چلتا ہے کہ بہتری کہاں حالت اور بدتر ہو گئی۔ بدترحالت کا بھی ایک عام اور قدرتی سبب ہے۔ نئے بادشاہ کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ اپنی فوج کو حال میں فتح کئے ہوئے علاقوں میں اتار رے، ان پر محصول لگائے اور

اسی قسم کی ہزار باتیں ہیں جنہیں نئی فتح کے لوازم میں سے سمجھنا چاہیئے جن جن کو نئے بادشاہ کے آنے سے دقتیں پیش آتی ہیں یا کسی قسم کا نقصان ہوتا ہے وہ بادشاہ کے جانی دشمن بن جاتے ہیں۔ رہے وہ جو نئے بادشاہ کے آنے کا سبب ہوئے سو ان کی دوستی قائم نہیں رہتی۔ نہ تو ان کی توقعات ہی پوری کی جا سکتی ہیں اور نہ ان پر، ان کے احسان کا لحاظ رکھتے ہوئے، سختی ہی کی جا سکتی ہے۔ پس نیا علاقہ فتح کرنے کے لئے غاصب کا قوی ہونا اور اس کے پاس بڑی فوج کا ہونا کافی نہیں۔ اس علاقے کے باشندوں کی خوشنودی بہت ضروری ہے۔

یہی اسباب تھے کہ مالان کو شاہ فرانس لوئیز دوازدہم کے ہاتھ[1] آتے تو دیر نہیں لگی۔ مگر وہ جلد ہی ہاتھ سے نکل بھی گیا۔ وہی لوگ جنہوں نے اس کا خیر مقدم کیا تھا جب انہوں نے دیکھا کہ ان کی امیدیں

---

[1] لوئیز دوازدہم نے اہل وینس کے ساتھ مالان فتح کرنے کے لئے اتحاد کیا۔ ۱۱ ستمبر ۱۴۹۹ء کو فرانسیسی فوجیں شہر میں داخل ہوئیں۔ ڈیوک لوڈوک فرار ہو کر جرمنی چلا گیا، جرمنوں اور سوستانیوں کی مدد سے ۵ فروری ۱۵۰۰ء کو اس نے مالان پر پھر قبضہ کر لیا۔ مگر جب فرانسیسیوں کو کمک پہونچی تو اسے ۵ اپریل کو پھر شکست ہوئی اور وہ قید کر لیا گیا۔

بر نہیں آئیں اور ان کی توقعات پوری نہیں ہوئیں تو پھر وہ نئے بادشاہ کی اکڑ فوں کو کیوں برداشت کرتے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ جو ممالک بغاوت کرتے ہیں اور دوبارہ فتح کئے جاتے ہیں وہ آسانی کے ساتھ ہاتھ سے نہیں نکلتے۔ بات یہ ہے کہ بغاوت کو بہانہ بنا کر غاصب اپنا قبضہ جمانے کے لئے بلا روک ٹوک مجرموں کو سزائیں دیتا، مشتبہ لوگوں کی پردہ دری کرتا اور جہاں اپنی کمزوری دیکھتا ہے اسی وقت اس کا استیصال کر دیتا ہے۔ چنانچہ کاؤنٹ لوڈووِک نے پہلی مرتبہ تو صرف ستا ستا کر اور سرحد پر چھاپے مار مار کر مائلان کو فرانسیسیوں سے چھین لیا لیکن دوسری دفعہ جب فرانسیسی مائلان سے نکلے ہیں تو کیا کچھ جتن کرنا پڑے۔ ایک دنیا کو مسلح کر کے فرانسیسی بادشاہ کے خلاف کھڑا کیا گیا تاکہ اطالیہ سے اس کی فوجوں کو نکال باہر کیا جائے۔ اور اس کی وجہ وہی تھی جو اوپر بیان ہوئی۔ تصویر کا ایک رخ تو دیکھ لیا اب دوسرا

---

ے ۱۵۱۱ء میں پوپ جولیس دوم نے "مقدس لیگ" بنائی جس میں وینس، فرڈیننڈ شاہ ارا گان اور ہنری ہشتم شاہ انگلستان شامل ہوئے۔ سوسٹانیوں کی مدد سے ۱۵۱۲ء میں فرانسیسی لومبارڈی سے نکال باہر کئے گئے۔

رخ ملاحظہ کیجئے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ شاہ لوئیز کو اس کا کیونکر تدارک کرنا چاہیئے تھا اور اگر اب کوئی دوسرا شخص شاہ فرانس کی جگہ ہو تو وہ نئے مقبوضات پر اپنی حکومت قایم رکھنے کے لئے کیا کیا بہتر تدابیر اختیار کرے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ایسے نئے حاصل کئے ہوئے صوبے جو فاتح کے اپنے قلمرو میں شامل کر لئے گئے ہوں ان کا تعلق یا تو فاتح کے ملک اور زبان سے ہوگا یا کسی دوسرے ملک اور زبان سے۔ اگر ملک اور زبان ایک ہیں تو انہیں قابو میں رکھنا آسان ہوگا۔ خاص طور پر اس صورت میں جب کہ لوگ آزادی کے بہت زیادہ عادی نہ ہوں۔ قبضہ کو قایم رکھنے کے لئے بس یہ ضروری ہے کہ جس خاندان کی وہاں حکومت رہی ہو اسے نیست و نابود کر دیا جائے۔ لوگوں کی زندگی میں کسی قسم کا فرق نہ آئے گا اور ان کے رسوم جوں کے توں رہیں گے تو وہ نئی حکومت کو تسلیم کریں گے اور چپ چاپ زندگی گذاریں گے۔ برگنڈی، برٹیان، گاسکان اور نارمنڈی میں یہی ہوا[1]۔ ان صوبوں میں

---

[1] یہ صوبے مختلف اوقات میں فرانس میں شامل ہوئے۔ نارمنڈی کو شاہ فلپ آگسٹس نے ۱۲۰۴ء میں حاصل کیا۔ گاسکان کو چارلس ہفتم نے ۱۴۵۳ء میں اور برگنڈی کو لوئیز یازدہم نے ۱۴۷۷ء میں۔ برٹیان ۱۴۹۱ء میں فرانس کو ملا جب وہاں کی شہزادی این سے چارلس ہشتم کی شادی ہوئی۔

ایک مدت سے فرانس کی حکومت ہے۔ زبان میں معمولی
سا فرق سہی مگر ان کے قوانین اور رسوم یکساں ہیں اسی لئے
وہ ایسی آسانی کے ساتھ فرانس کا جزو بن گئے ہیں۔ پس جو کوئی
نیا علاقہ فتح کرے اور اسے قبضہ میں رکھنا چاہے اس کے
لئے ضروری ہے کہ دو باتوں کا خاص طور پر خیال رکھے۔
ایک ہے سابق بادشاہ کے خاندان کو ختم کرنا اور دوسرے
نئے قوانین اور محصولوں سے اجتناب کرنا۔ اس اصول پر عمل
کرنے سے تھوڑے ہی دنوں میں نئے علاقے کو سابقہ قلمرو
سے ملحق کر کے دونوں کو ایک کیا جا سکتا ہے بشرطیکہ قسمت بھی
ساتھ دے اور خاص طور پر تدبیر بھی کی جائے۔ اور سب سے
بڑی اور کارگر تدبیر یہ ہے کہ غاصب وہیں جا کر سکونت اختیار
کرے تاکہ اس کا قبضہ برقرار رہے، جیسا کہ ترکوں کے سلطان
نے یونان[1] میں کیا ہے۔ یونان کو قابو میں رکھنے کے لئے وہ چاہے
جو بھی تدابیر اختیار کرتا، مگر ایک کارگر نہ ہوتی اگر سلطان وہیں
جا کر نہ رہتا۔ بادشاہ خود موجود ہو تو یہ آسانی ہوتی ہے
کہ فتنہ و فساد کا شروع ہی میں پتہ چل جاتا ہے اور اسے

---

[1] یونان سے مراد جزیرہ نمائے بلقان ہے جسے مراد دوم (۱۴۴۲ء تا ۱۴۵۱ء) اور محمد دوم (۱۴۵۱ء تا ۱۴۸۱ء) نے فتح کیا۔ ۱۴۵۳ء میں جب قسطنطنیہ فتح ہو گیا تو سلطان نے وہیں سکونت اختیار کی۔

دبانا زیادہ مشکل نہیں ہوتا۔ لیکن اگر بادشاہ کسی دور دراز مقام پر رہتا ہو تو فتنہ کا پتہ دیر میں چلتا ہے اور جب پانی سر سے اوپر آ جائے تب ایک بنائے نہیں بنتی۔ ایک اور بات یہ ہے کہ اگر بادشاہ مفتوحہ علاقے میں بود و باش اختیار کرے تو قریب ہونے کی وجہ سے رعایا کی اس تک پہنچ ہوتی ہے اور حکام کے ظلم و تعدی سے لوگ محفوظ رہتے ہیں۔ اس کا یہ نتیجہ بھی ہوتا ہے کہ نیک افراد اس سے محبت کرنے لگتے ہیں اور بد اس سے ڈرنے لگتے ہیں۔ اگر کوئی اور ایسے صوبہ کو فتح کرنے کا ارادہ کرے تو اسے خاص اہتمام کرنا چاہئے اس لئے کہ بادشاہ جس جگہ خود رہتا ہو اس کو وہ آسانی سے اپنے ہاتھ سے نہیں نکلنے دے گا۔

ایک اور کسی قدر بہتر تدبیر بھی ہے۔ وہ یہ کہ ایک یا دو نہایت ہی اہم مقام منتخب کئے جائیں اور ان میں نو آبادیاں بسائی جائیں۔ نو آبادیاں نہیں تو پیدل اور سوار فوج ان مقامات پر رکھی جائے۔ مگر فوجیں رکھنے سے نو آبادیاں بسانا کہیں بہتر ہے۔ کم خرچ بالانشین۔ نو آبادیاں بسانے اور ان کو قابو میں رکھنے میں بہت تھوڑے سے اخراجات ہوتے ہیں نئے آنے والوں کی تعداد

مختصر ہوتی ہے اور وہ ریاست کا چھوٹا سا جزو ہوتے ہیں۔
ان کی معاش اور رہائش کے لئے حاکم کی دست اندازی
بس ایسے لوگوں تک محدود رہتی ہے جن کے گھر بار اور
جائدادیں وہ یوں بھی ضبط کرنا چاہتا ہے۔ پھر وہ جن کو
اس سے نقصان پہنچتا ہے اور جو اس سے خفا ہوتے
ہیں وہ اِدھر اُدھر بکھرے ہونے کی وجہ سے، نیز
مفلسی کے سبب سے کسی قسم کی شرارت نہیں کر سکتے۔ باقی
جو لوگ رہے وہ چین و آرام کی زندگی گذارتے ہیں۔
وہ اس خوف سے شورش برپا نہیں کرتے کہ کہیں ان کا
بھی وہی حشر نہ ہو جو ان کے ہمسایوں کا ہوا اور کہیں
وہ بھی ہاتھ سے گھر بار نہ کھو بیٹھیں۔

چنانچہ میں جس نتیجہ پر پہنچا ہوں وہ یہ ہے کہ ان
نو آبادیوں پر خرچ کچھ نہیں ہوتا، وہ وفادار ہوتی ہیں
اور ان سے اصل باشندوں کو کچھ ضرر نہیں پہنچتا۔ باقی
رہے وہ تھوڑے سے اشخاص جن کو تکلیف پہونچتی ہے
سو وہ اتنے مفلس ہوتے ہیں اور اس بری طرح بکھرے
ہوئے کہ وہ حاکم کا بال بیکا نہیں کر سکتے۔ اور یہ بات
یاد رکھنے کی ہے کہ لوگوں کو یا تو خوشامد اور عنایتوں سے
رام کرنا چاہئے اور یا انہیں ملیامیٹ کر دینا چاہئے۔

چھوٹی چھوٹی زیادتیوں کا انسان بدلہ لے لیتا ہے مگر
بڑے مظالم کے جواب میں کچھ نہیں کر سکتا۔ پس اگر کسی کو
نقصان ہی پہونچانا مقصود ہو تو اس طرح کہ بدلہ کا سوال
ہی نہ پیدا ہو۔ نو آبادیاں بسانے کی بجائے فوج رکھنے
کا فیصلہ کیا جائے تو مصارف بہت زیادہ برداشت
کرنا ہوں گے۔ پھر چونکہ صوبہ کی تمام آمدنی اسی کو
قابو میں رکھنے پر صرف ہو جائے گی اس لئے اس فتح
سے حاصل کچھ نہ ہوگا اور فائدہ کی جگہ الٹا نقصان ہوگا
ملک میں فوجوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے
اور ان کی جائے قیام بار بار بدلنے سے ہر شخص کو تکلیف
ہوگی اور اس کے دل میں بدلہ لینے کی خواہش پیدا ہوگی
نیز جو لوگ اپنے ہی گھروں میں دوسروں کی زیادتیوں
کا شکار ہوتے ہیں ان سے زیادہ خطرناک اور جانی
دشمن شاید ہی کوئی ہو۔ غرض جس نقطۂ نظر سے بھی دیکھا
جائے فوجیں رکھنے سے نو آبادیاں بسانا بہتر ہے۔
علاوہ ازیں جو کوئی کسی دوسرے صوبہ میں جا کر حکومت
کرے اسے چاہئے کہ اپنے کمزور ہمسایوں کے سر پہ
دست شفقت رکھے اور ان کی مدافعت کرے اور جو طاقتور
اور ذی اثر ہوں ان کا زور گھٹائے۔ آسے اس کی

بھی خاص طور پر فکر رکھنی چاہئے کہ کوئی اپنی طرح طاقتور اجنبی اس صوبہ میں نہ داخل ہونے پائے۔ اس لئے کہ یہ اکثر ہوتا ہے کہ جو لوگ ناراض یا غیر مطمئن ہوتے ہیں وہ کبھی حوصلہ اور لالچ کی وجہ سے اور کبھی خوف کی بنا پر کسی نہ کسی کو باہر سے بلواتے ہیں۔ مثال کے طور پر باشندگانِ ایتولیہ[1] کو لیجے جو اہل روما کو یونان میں لانے کا سبب ہوئے۔ اہل روما کبھی بھی یونان کے کسی حصہ میں داخل نہ ہونے پاتے جب تک اس جگہ کے باشندے ان کو وہاں آنے پر آمادہ نہ کر لیتے۔ ان حالات میں عام طور پر جو ہوتا ہے وہ یہ ہے۔ بیرونی حاکم کے صوبہ میں داخل ہوتے ہی طاقتور لوگوں سے حسد کی وجہ سے کمزور اس سے جا ملتے ہیں۔ ان کمزور افراد کو اپنی طرف کر لینا کوئی ایسا مرحلہ نہیں۔ ایک دفعہ یہ لوگ فاتح کی جانب آ جائیں تو پھر وہ آسانی سے اُس کی ریاست میں گھل مل

---

[1] ایتولیہ یونان کے ایک شمالی حصہ کا نام ہے۔ ۲۱۲ ق م میں جب ایتولیہ کی وفاقی حکومت نے فلپ پنجم، شاہ مقدونیہ کے ہاتھوں شکست کھائی تو کسی بیرونی ریاست سے اتحاد کا خیال ہوا، اور اس نے روما کے ساتھ ایک معاہدہ کیا۔ چنانچہ جب روما اور یونان میں جنگ ہوئی تو اہل ایتولیہ نے خوب داد شجاعت دی اور اہل روما کو جو فتح ۱۹۷ ق م میں حاصل ہوئی اس میں ان کا بڑا حصہ تھا۔

جاتے ہیں فاتح کو بس ایک بات کا خیال لازم ہے۔ یہ کہ وہ بہت زیادہ طاقتور نہ ہونے پائیں۔ ان کے ہاتھ میں بہت زیادہ اختیارات بھی نہ دینے چاہئیں۔ اس اصول پر وہ عمل پیرا ہوگا تو اپنی فوجوں اور متذکرہ بالا افراد کی مدد سے وہ نہایت آسانی کے ساتھ اپنے ہمسایوں کو نیچا دکھا سکے گا اور اس صوبہ کے سیاہ و سفید کا مالک بن سکے گا۔ اور جو کوئی اس اصول پر عمل نہیں کرے گا اس کے ہاتھ سے حکومت جاتی رہے گی اور جب تک اس کا قبضہ رہے گا اس وقت تک اسے ہزاروں تکلیفیں اور مصیبتیں پیش آتی رہیں گی۔ اہل روما جب بھی کوئی نیا علاقہ فتح کرتے تھے تو اسی اصول پر عمل پیرا ہوتے تھے۔ فوجی نوآبادیاں بساتے تھے اور کمزور امراکو اپنے سایہ عاطفت میں لیتے تھے، گو ان کی قوت میں اضافہ نہ ہونے دیتے۔ جو زیادہ قوی ہوتے انھیں سر نہ اُٹھانے دیتے اور کسی غیر ۔۔ شاہ کو ان سے ساز باز کا موقع نہ دیتے تھے بمثال کے طور پر یونان کا ذکر کافی ہے باشندگان ایتولیہ و اکیو کو کس طرح اہل روما نے اپنے تحت میں لیا اور مقدونیوں کو کس طرح دبایا

اور انیتوکس[۱] کو نکال باہر کیا۔ لیکن باوجود ان کی تمام خوبیوں اور وفاداریوں کے اہل اکے اور اہل ایتولیہ کے اختیارات میں کسی قسم کا اضافہ روا نہ رکھا گیا۔ فلپس[۲] نے بہت ہاتھ پاؤں مارے اور ہزار التماس کی مگر اہل روما اس کے اس وقت تک دوست نہ بنے جب تک اسے زیر نہ کر لیا۔ اور انیتوکس باوجود اپنی قوت کے انھیں اس بات پر آمادہ نہ کر سکا کہ صوبہ کی حکومت میں اس کا ذرا بھی دخل ہو۔ رومیوں نے وہی کیا جو ہر اس عقلمند بادشاہ کو کرنا چاہئے جس کی نظر نہ صرف حال بلکہ مستقبل کی دقتوں پر بھی ہو اور جسے ان دقتوں کو کسی نہ کسی طرح سر کرنے کی فکر بھی ہو۔ اس لئے کہ اگر آنے والے خطرہ کا پہلے سے پتہ چل جائے تو اس کا

---

[۱] انیتوکس ثالث مراد ہے۔ ملک شام کا بادشاہ ۱۹۲ق۔م۔ میں اہل ایتولیہ کی دعوت پر اپنی فوجوں کے ساتھ یونان آیا اور اہل روما سے جنگ کی، مگر منہ کی کھائی۔ اسے زبردست شکست ہوئی۔

[۲] فلپ پنجم، شاہ مقدونیہ مراد ہے۔ اس نے اینتوکس کے خلاف رومیوں کا ساتھ دیا۔ مگر اسے اپنی فتوحات کا ایک حصہ جنگ کے بعد واپس کرنا پڑا اس لئے کہ اہل روما یہ نہیں چاہتے تھے کہ اس کی طاقت بہت بڑھ جائے۔

کچھ نہ کچھ کاٹ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر بے توجہی برتی جائے یہاں تک کہ خطرہ سر پر آن موجود ہو تو پھر ایک بنائے نہیں بنتی اس کی مثال تپ دق جیسی ہے جس کے متعلق طبیبوں کا خیال ہے کہ شروع میں اس کی تشخیص مشکل ہوتی ہے اور علاج سہل اور بعد میں تشخیص آسان سہی مگر علاج بہت ہی کٹھن ہوتا ہے۔ بس یہی حال سیاسی معاملات کا ہے اگر فتنوں کو دور سے پہچان لیا جائے (اور پہچان سکتے ہیں صرف عقلمند لوگ) تو وہ زیادہ بڑھنے نہیں پاتے اور انہیں آسانی سے رفع دفع کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر نادانی یا بے پرواہی سے انھیں بڑھنے دیا جائے یہاں تک کہ ہر شخص انھیں شناخت کر سکے تو پھر کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوتی اور مرض لاعلاج ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اہل روما آنے والے خطروں کو دور سے تاڑ لیا کرتے تھے اور ان کا تدارک بھی وقت پر کر لیتے تھے۔ وہ جنگ کو کچھ دنوں کے لئے ٹالنے کی غرض سے نقصان کبھی نہیں برداشت کرتے تھے۔ اس لئے کہ انھیں خوب معلوم تھا کہ ان ترکیبوں سے جنگ سے بچنا ممکن نہیں۔ جنگ کو صرف تھوڑے عرصہ کے لئے ٹالا جا سکتا ہے اور اس التوا سے اکثر دشمن ہی فائدہ اٹھاتا ہے۔ اسی لئے اُنھوں نے فلپ[1]

---

[1] دوسری جنگ مقدونیہ میں ۲۰۰ء تا ۱۹۷ء ق۔م

اور انیتوکس[۱] سے یونان میں جنگ کرنا بہتر سمجھا اور یہ انتظار نہ کیا کہ وہ اطالیہ پر حملہ آور ہوں۔ حالانکہ انہیں ان میں سے ایک سے بھی جنگ کرنے کی کوئی فوری ضرورت نہ تھی۔ وہ چاہتے تو لڑائی کو ملتوی کر سکتے تھے۔ مگر انہوں نے اسے مناسب نہ سمجھا۔ ایک قول جو ہمارے نئے سیاست دانوں کی زبان پر رہتا ہے یہ ہے "موجودہ مہلت سے فائدہ اٹھاؤ" مگر اہل رومہ کو یہ اصول کبھی نہ بھایا۔ انہوں نے ہمیشہ اپنی ہمت اور حکمت سے کام لینے کو ترجیح دی۔ وقت کا کچھ ٹھیک نہیں۔ اچھائی کے ساتھ برائی اور برائی کے ساتھ اچھائی وقت کے ہمراہ چلا کرتی ہے۔

آئیے اب ہم دوبارہ فرانس پر ایک نظر ڈالیں اور ہم نے جو اصول متعین کئے ہیں ان کی روشنی میں فرانس کی حالت کا مطالعہ کریں۔ چارلس ہشتم کا میں اس وقت ذکر نہیں کرتا۔ میرے پیش نظر لوئز دوازدہم ہے جس کا قبضہ اطالیہ پر زیادہ عرصہ تک رہا اور اس وجہ سے اس کا طریق عمل زیادہ نمایاں[۲] ہے

---

[۱] شام اور ایتولیر کی جنگ میں ۱۹۲ تا ۱۹۱ ق۔م

[۲] چارلس ہشتم کی اطالوی مہم ایک سال تک جاری رہی، ستمبر ۱۴۹۴ء سے اکتوبر ۱۴۹۵ء تک۔ لوئز دوازدہم ۱۴۹۹ء میں اطالیہ آیا اور ۱۵۱۲ء میں پاپائے روما جولیس دوم کے ساتھ جنگ میں ہارا تو اس کے اطالوی مقبوضات اس کے ہاتھ سے نکل گئے۔

ہر شخص یہ دیکھ سکتا ہے کہ ایک بیرونی ریاست کو اپنے زیر حکومت رکھنے کے لئے جو جو تدبیریں اختیار کرنی چاہیئے تھیں ان پر اس نے عمل نہیں کیا اور ہر موقع پر الٹی ہی تدبیریں اختیار کیں۔ اس لوئیز کو وینس والوں نے اطالیہ آنے کی دعوت دی تھی اور اہل وینس کی آرزو یہ تھی کہ اس کی مدد سے نصف لومبارڈی پر اپنا قبضہ جمایا جا سکے میں اس مہم پہ اعتراض نہیں کرتا اور نہ اس فیصلہ کو برا کہتا ہوں۔ شاہ لوئز کی خواہش یہ تھی کہ اطالیہ میں اپنے قدم جمائے مگر جب اس نے دیکھا کہ اس ملک میں کوئی بھی اس کا ساتھی نہیں (اس کے پیش رو چارلس نے اہل اطالیہ کے ساتھ جو بدسلوکیاں کی تھیں ان کی وجہ سے) اور سارے دروازے اس پر بند ہو گئے تو پھر اس کے لئے سوائے اس کے اور کوئی صورت نہ تھی کہ جہاں بھی ممکن ہو لوگوں کو دوست بنائے۔ اور یہ روش اس کی مشکلات کو حل بھی کر دیتی اگر اس کے دوسرے انتظامات الٹ پلٹ نہ ہو جاتے۔ اس لئے کہ لومبارڈی کو زیر نگیں کرتے ہی وہ ساری عظمت اور ناموری جو چارلس نے گنوا دی تھی۔ لوئیز نے دوبارہ حاصل کر لی۔ جینوا نے اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کیا فلورنس اس کی دوستی کا خواہاں ہوا۔ مارکوئیس آف مانتوا.

ڈیوک آف فرارا، بنتی و دیولیو[1]، مدام دے فورلی، فائنزا، پسورو، ریمینی، اکامیر بینو، پیومبینو کے فرماں روا اور لچیسی، پسا اور سینیسی کی جمہوریتیں سب کے سب اتحاد اور دوستی کی غرض سے اس کی طرف رجوع ہوئے تب اہل وینس کو بھی اپنی حماقت کا اندازہ ہوا کہ لومبارڈی کے دو[2] شہروں کی خاطر انہوں نے شاہ فرانس کو دو تہائی اطالیہ کا مالک بنوا دیا۔ اب آپ ہی خیال فرمائیے کہ بادشاہ کس قدر آسانی سے اپنی عزت قایم رکھ سکتا تھا اگر وہ متذکرہ بالا اصولوں پر عمل کرتا، اپنے دوستوں کی حمایت کرتا جن کی تعداد بہت بڑی تھی مگر جو کمزور اور خائف ہونے کی وجہ سے (بعض کو پاپائے روم کا خوف تھا اور بعض کو وینس والوں کا) ہمیشہ اس کا ساتھ دینے پر مجبور رہتے اور ان کی مدد سے وہ اپنے ہر مد مقابل کو نیچا دکھا سکتا تھا۔ مگر اس نے مائلان میں آتے ہی ایک پلٹا کھایا اور پوپ الکزانڈر کو روماناپر قبضہ جمانے میں مدد دی[3]۔ اس نے ذرا خیال

[1] مراد ہے ژیووانی بنتی وو یو، شاہ بلونا۔
[2] یہاں پر مکیاویلی نے مبالغہ سے کام لیا ہے ۱۴۹۹ء کے عہد نامہ کی رو سے وینس کو سارا غیارا دوا ملنا چاہئے تھا۔
[3] سیزر بورژیا کو لوئز دوازدہم سے ۰۰۰ ۴ پیادہ فوج اور ۳۰۰ سوار ملے

نہ کیا کہ یہ اس کی کمزوری کا باعث بنے گا اور جو دوست
اس کا دم بھرتے ہیں وہ اس سے ناخوش ہو جائیں گے اور
کلیسا کا رتبہ بڑھ جائے گا اس لئے کہ کلیسا کی دینی طاقت پر
جو پہلے ہی سے بہت زیادہ تھی دنیاوی قوت کا اضافہ ہوگا۔
ایک دفعہ جب یہ غلطی سرزد ہو گئی تو پھر وہ ایک مقررہ
راہ پر چلنے پر مجبور تھا، یہاں تک کہ وہ دوبارہ اطالیہ
آنے پر مجبور ہوا تا کہ پاپائے روما الکزانڈر کے حوصلوں
کا خاتمہ کر سکے اور اسے ٹسکنی کا مالک نہ بننے دے۔ پھر
یہی نہیں کہ اس نے کلیسا کو فائدہ پہونچایا ہو، نیپلس کو
خوش کرنے کے لئے اس نے شاہ ہسپانیہ کو اپنا شریک
بنایا، نتیجہ یہ ہوا کہ جہاں پہلے تمام اطالیہ میں اس کا بول
بالا تھا وہاں اس کا ایک ساجھی پیدا ہو گیا جس کی طرف اس
صوبہ کے جاہ طلب افراد اور ایسے لوگ جو لوئز سے ناخوش
ہوں بعض موقعوں پر رجوع کر سکتے تھے۔ اور گو یہ امکان تھا

---

۱ اصل میں اسے ہسپانیہ کے خلاف جنگ کی تیاری کی وجہ سے آنا پڑا۔

۲ ۱۵۰۲ء میں سیزر بورژیا فلورنس پر حملہ کی تیاری کر چکا تھا مگر لوئز کے آنے کی وجہ سے اسے ہاتھ روکنا پڑا۔ اس لئے کہ لوئز نے ۱۰ اپریل کے معاہدہ کی رو سے فلورنس کو کمک بھیجنے کا وعدہ کیا تھا۔

۳ معاہدہ غرناطہ مورخہ ۱۱ نومبر ۱۵۰۰ء کی رو سے نیپلس کو لوئز اور فرڈی نینڈ شاہ ارگان کے درمیان تقسیم کرنا طے پایا۔

کہ اس ملک کا بادشاہ اس کا وظیفہ خوار بن کر رہے[1] ہے لیکن اس نے اسے نکال باہر کیا اور اس کی جگہ ایک دوسرے بادشاہ کو دی تاکہ یہ بادشاہ الٹا اسے نکال باہر کر سکے!

یہ بالکل بدیہی اور قدرتی امر ہے کہ بادشاہوں کو اپنی قلمرو کو وسعت دینے کی خواہش ہوتی ہے اور جب وہ صرف ایسے مقاصد کو حاصل کرنے کا قصد کرتے ہیں جن کو حاصل کرنا ان کے لئے ممکن ہوتا ہے تو لوگ ان کی مدح وثنا کرتے ہیں یا کم از کم بُرائی نہیں کرتے۔ مگر جب وہ ایسا مقصد حاصل کرنا چاہتے ہیں جو ان کے بس کی بات نہیں ہوتی تو وہ قصوروار ٹھہرائے جاتے ہیں۔ اور یہ کچھ بیجا بھی نہیں۔

پس اگر فرانس کے لئے یہ ممکن تھا کہ تنہا نیپلس پر قابض ہو جائے تو اسے یہی کرنا چاہئے تھا۔ لیکن اگر اس کی اپنی قوت اتنی نہ تھی تب بھی اسے تقسیم پر راضی نہ ہونا چاہئے تھا۔ لومبارڈی میں اہل وینس کو شریک کرنے کی تو پھر بھی ایک وجہ تھی، اس لئے کہ اس سے فرانس کو اطالیہ میں قدم جمانے کا موقع ملا۔ مگر نیپلس میں شاہ ہسپانیہ کو شریک کرنا تو خاص طور پر ناقابل معافی ہے کہ لومبارڈی کے برخلاف یہاں اس کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ اس طرح اطالیہ کی مہم

---

[1] فریڈرک شاہ نیپلس اس پر آمادہ تھا کہ فرانس کی ماتحتی قبول کرلے۔

میں لوئز سے پانچ خطائیں سرزد ہوئیں۔ اس نے کمزوروں کو تباہ و برباد کیا، اس نے ایک پڑوسی بادشاہ کے قلمرو کو وسعت دی۔ اس نے ایک بدیسی کو وہاں بلایا جو قوت میں اس کی برابری کرتا تھا۔ اس نے ذاتی طور پر اطالیہ میں بود و باش اختیار نہ کی اور نوآبادیاں بھی نہ بسائیں۔ مگر شاید اِن تمام غلطیوں کا خمیازہ اسے اپنی زندگی میں نہ بھگتنا پڑتا اگر اس نے ایک چھٹی غلطی نہ کی ہوتی یعنی وینس کی قوت کو دبانا۔ البتہ اگر اس نے کلیسا کا ساتھ نہ دیا ہوتا اور ہسپانیوں کو اطالیہ میں آنے نہ دیا ہوتا تو پھر اہل وینس کو نیچا دکھانا بالکل مناسب ہوتا۔ اور اگر اپنے دوسرے ارادوں کو عملی جامہ پہنانا تھا تو پھر اہل وینس کو تباہ نہ ہونے دینا چاہئے تھا۔ اس لئے کہ اگر اہل وینس کی قوت پورے طور پر برقرار رہتی تو وہ کسی دوسرے کو لومبارڈی میں قدم نہ دھرنے دیتے۔ سوائے اس صورت کے کہ کوئی فاتح اس پر راضی ہوتا کہ فتح کرکے وہ اسے ان کے حوالہ کر دے، اور بھلا کوئی کیوں لومبارڈی کو فرانس سے اس لئے چھینتا

---

۱۵۰۸ء میں فرانس، پوپ، شہنشاہ اور اسپین نے اہل وینس کے خلاف ایک لیگ قایم کی جو کمبرائی کی لیگ کے نام سے مشہور ہے۔ اس لیگ نے اہل وینس کو ۱۵۰۹ء میں شکست فاش دی۔

کہ اسے اہل وینس کی نذر کرے۔ باقی رہا فرانس اور اہل وینس دونوں سے لڑنا سو کسی کو اس کی ہمت نہ ہوتی۔ اگر کوئی یہ دلیل پیش کرے کہ شاہ لوئیز نے جنگ سے بچنے کی خاطر روماتا کو پوپ کے حوالہ کیا اور نیپلس کی ریاست شاہ ہسپانیہ کو دے دی تو میرا جواب وہی ہے جو میں پہلے دے چکا ہوں۔ جنگ سے بچنے کی خاطر ناقابل اطمینان حالات کو جاری رہنے دینا ٹھیک نہیں اس لئے کہ جنگ ہمیشہ کے لئے تو ٹلتی نہیں۔ صرف کچھ عرصہ کے لئے ملتوی ہو جاتی ہے اور جب پیش آتی ہے تو اور بھی زیادہ دقتوں کا سامنا کرنا ہوتا ہے۔ اگر کوئی یہ کہے کہ پاپائے روما سے اس نے مدد کا جو وعدہ کیا وہ دراصل صلہ تھا اس کے فسخ نکاح[1] کا اور روئن کے آرچ بشپ کو کارڈینل[2] بنانے کا تو میں جو کچھ بعد میں بادشاہ کے وعدوں اور ان وعدوں کو پورا کرنے کے متعلق کہنے والا ہوں اس کی طرف توجہ

---

[1] ۱۴۹۸ء میں لوئیز دوازدہم اور پوپ الکزانڈر ششم نے آپس میں یہ طے کیا کہ شاہ فرانس کا نکاح جو لوئیزیا نہم کی لڑکی سے ہوا تھا اسے پوپ فسخ کر دے تاکہ وہ چارلس ہشتم کی بیوہ این سے شادی کر سکے۔ اس کے بدلے میں لوئیز دوازدہم نے پوپ کو روماناپر قبضہ کرنے میں مدد دینے کا وعدہ کیا۔

[2] لوئیز دوازدہم کا وزیراعظم ۱۴۹۸ء میں کارڈینل بنا۔ نام تھا ڑورژ دامبا۔

منعطف کراؤں گا۔ غرض یہ کہ شاہ لوئیز کے ہاتھ سے لومبارڈی نکل جانے کی وجہ یہ تھی کہ وہ ان اصولوں پر عمل پیرا نہ ہوا جن کی بدولت دوسرے بادشاہ کامیابی کے ساتھ غیر علاقوں کو فتح کرتے اور ان پر حکومت کرتے چلے آئے ہیں۔ یہ کوئی غیر معمولی بات بھی نہیں۔ آئے دن ایسا ہوتا رہتا ہے اور نہ کچھ بلا سبب۔ خوب یاد آیا۔ ایک دفع میری گفتگو اسی موضوع پر کارڈینل داما سے نانتے میں ہوئی تھی۔ وقت وہ تھا جب والنتینو (کہ عام طور پر پوپ الکزانڈر کا بیٹا سیزر بورژیا اسی نام سے پکارا جاتا تھا) نے رومانا پر قبضہ کیا۔ بحث کی گرما گرمی میں جب کارڈینل نے یہ کہا کہ اطالوی فن جنگ سے بالکل ناآشنا ہیں تو میں نے جواب دیا کہ فرانسیسی امور مملکت میں اسی طرح کورے ہیں۔ اگر انھیں ذرا بھی سیاسی معاملات کی سمجھ ہوتی تو کبھی کلیسا کو اتنی عظمت اور وقار نہ حاصل کرنے دیتے۔ اب تجربہ سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ اطالیہ میں کلیسا اور ہسپانیوں کی ساری شان و شوکت فرانس ہی کے طفیل

---

[1] اگست سے لے کر دسمبر ۱۵۰۰ء تک میکیاویلی فرانس میں فلورنس کا سفیر تھا۔ اور شاہ فرانس کا اکتوبر اور نومبر کے مہینوں میں نانتے میں قیام تھا۔ یوں یہ ملاقات ہوئی۔

میں ہے۔ اور اس کا صلہ فرانس کو ملا، تباہی اور اخراج
کی صورت میں!

جو کچھ اب تک کہا گیا اس سے ایک کلیہ کا استنباط
ہوتا ہے۔ اور کلیہ ایسا ہے جو مستثنیات سے بے خبر ہے۔
یعنی یہ کہ دوسرے کو ترقی دلانا دراصل اپنی جڑ آپ کاٹنے
کے مرادف ہے۔ اس لئے کہ دوسرے کی ترقی ہوتی ہے
یا تو مدد کرنے والے کے حسن تدبیر سے یا قوت بازو سے۔
اور یہ دونوں بالآخر فروغ پانے والے شخص کی آنکھ میں
کانٹے کی طرح کھٹکتی ہیں۔

# باب ۴

## دارا کی ریاست جسے سکندر نے فتح کیا وہاں سکندر کی موت کے بعد اس کے جانشینوں کے خلاف علم بغاوت کیوں نہ بلند کیا گیا؟

اگر ان مشکلات کا خیال کیا جائے جو نئے فتح کئے ہوئے علاقوں کو قابو میں رکھنے میں پیش آتی ہیں تو اس بات پہ اچنبھا سا ہوتا ہے کہ سکندر اعظم جو تھوڑے عرصہ میں تمام ایشیا پر چھا گیا مگر جلد ہی اس دنیا سے کوچ بھی کر گیا اس کی مملکت میں کہیں بھی بغاوت نہ ہوئی۔ اس کے جانشینوں نے ایک عرصہ تک ان تمام علاقوں پر چین سے حکومت کی۔ ان مصیبتوں کو تو جانے دیجئے جو خود ان کی حرص و طمع اور جاہ طلبی کا نتیجہ تھیں ورنہ انہیں نہ تو کسی قسم کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اور نہ ان کی کسی سے مٹھ بھیڑ ہوئی۔ بات یہ ہے کہ بادشاہتیں جن کا تھوڑا بہت حال ہمیں معلوم ہے ان پر حکومت کے دو علیحدہ علیحدہ طریقے تھے۔ ایک یہ کہ بادشاہ اپنے ملازمین کی مدد سے

حکومت کرتا ہے۔ ملازمین میں سے وہ جسے چاہتا ہے وزیر بناتا ہے اور ریاست کے نظم و نسق میں ان سے مدد لیتا ہے۔ دوسرا طریقہ وہ ہے جس میں حکومت بادشاہ اور جاگیرداروں کی ہوتی ہے جو بادشاہ کی عنایت نہیں بلکہ خاندانی قدامت اور اصالت کی بنا پر حکومت میں شریک ہوتے ہیں۔ ان جاگیرداروں کی اپنی عملداری بھی ہوتی ہے اور اپنی رعایا بھی جو ان کے حکم پر چلتی اور ان کی عزت کرتی ہے۔ ایسی مملکتوں میں جن پر بادشاہ اور اُس کے ملازمین کی حکومت ہوتی ہے وہاں بادشاہ کا طوطی بولتا ہے۔ اس لئے کہ تمام مملکت میں سوائے اس کے اور کسی کی برتری مسلم نہیں ہوتی۔ اور اگر کسی اور کے حکم کی تعمیل ہوتی بھی ہے تو وہ شخص بادشاہ کے وزیر یا نائب کی حیثیت سے اس لئے نہیں کہ اس شخص سے کوئی خاص محبت ہوتی ہے۔

ان مختلف اقسام کی حکومتوں کی مثالیں ہمارے زمانہ میں ترکی اور فرانس میں پائی جاتی ہیں۔ پوری ترکی سلطنت پر ایک سلطان کی حکومت ہے اور جو بھی حکام ہیں وہ اس کے ملازم ہیں۔ پوری سلطنت کو صوبوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے (جنھیں سنجیاک کہا جاتا ہے) ان صوبوں

میں وہ جب چاہتا ہے اور جسے چاہتا ہے مقرر کر دیتا ہے
اور اپنی خوشی سے ان میں ادل بدل کرتا رہتا ہے برخلاف
اس کے شاہ فرانس کو بہت سے بڑے بڑے جاگیردار
چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہیں۔ ان افراد کا اقتدار
مسلّم ہے اور ان کے خاندان کے ساتھ ایک مدت سے
رعایا کو ایک قلبی تعلق رہا ہے۔ اس وجہ سے انھیں ایک
طرح کی فضیلت حاصل ہے۔ بغیر اپنے آپ کو خطرہ میں
ڈالے ہوئے بادشاہ ان کا بال بیکا نہیں کر سکتا۔ پس
اگر دونوں حکومتوں کا موازنہ کیا جائے تو کہا جا سکتا ہے
کہ ترکی سلطنت کو زیر کرنا زیادہ مشکل ہے۔ لیکن ایک
دفعہ فتح ہو جائے تو پھر اس پر قبضہ رکھنا نسبتاً آسان
ہونا چاہیئے۔ فتح کرنا مشکل یوں ہے کہ غاصب کو ملک
کے اندر بلانے والا کوئی نہیں اور اس کی مہم میں اس
ملک کے افسروں سے کسی قسم کی مدد کا ملنا بھی قرینِ
قیاس نہیں۔ اس کے اسباب میں اوپر بیان کر چکا ہوں۔
سرکاری افسر سب کے سب بادشاہ کے بندے،
ان پر بادشاہ کے ہزار احسان۔ پھر وہ کیونکر آسانی
سے خریدے جا سکتے ہیں اور اگر وہ جانثار ہو جائیں
تو اس سے کچھ حاصل نہیں اس لیے کہ ان کا کوئی ساتھ

دینے والا نہ ہوگا۔ پس جو کوئی ترکوں پر حملہ کرے اسے یاد رکھنا چاہیئے کہ پوری متحدہ قوم اس کا مقابلہ کریگی۔ اسے اپنی قوت پر بھروسہ کرنا چاہیئے نہ کہ ان کے باہمی نفاق پر۔ ہاں ایک مرتبہ ان پر غلبہ حاصل ہو جائے اور ان کی فوج کو پوری شکست ہو جائے یہاں تک کہ انھیں ایک رنگروٹ ڈھونڈے نہ ملے، تب سمجھنا چاہیئے کہ خطرہ ختم ہو گیا۔ اس لئے کہ پھر بس ایک شاہی خاندان کی طرف سے جو ڈر ہوگا سو ہوگا۔ اور اگر شاہی خاندان کو نیست و نابود کر دیا گیا تو پھر کوئی بھی نہ ہوگا جس سے قوم کو دلچسپی ہو۔ فتح سے پہلے تو لوگوں پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا تھا۔ فتح کے بعد ان کی طرف سے کوئی اندیشہ نہ ہوگا۔ مگر جن ممالک میں فرانس کے نمونہ پر حکومت قایم ہو وہاں معاملہ بالکل برعکس ہوتا ہے۔ اس لئے کہ اگر چند جاگیرداروں کو اپنی طرف کر لیا جائے (اور یہ کچھ مشکل نہیں اس لئے کہ ایسا کبھی نہ ہوگا کہ ان میں سے بعض غیر مطمئن اور تبدیلی کے خواہاں نہ ہوں) تو پھر ملک میں فوراً داخلہ ممکن ہے۔ جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں یہ لوگ آسانی سے داخلہ کا انتظام بھی کر سکتے ہیں اور ملک فتح کرنے میں مدد بھی دے سکتے ہیں۔ لیکن جب

مفتوحہ علاقے کی مدافعت کرنے اور اس پر قبضہ رکھنے کا وقت آتا ہے تو پھر طرح طرح کی دقتیں پیش آتی ہیں۔ ان کی طرف سے بھی جنہوں نے آتے وقت مدد کی تھی اور ان کی جانب سے بھی جن کو فاتح کے آنے سے نقصان اٹھانا پڑے۔ پھر مقامی بادشاہ کی نسل کو نیست ونابود کرنا بھی کافی نہیں۔ اس لئے کہ دوسرے اکابر کو کیا کیجئے گا جو موقع کی تاک میں رہیں گے اور جب کوئی شورش برپا ہوگی تو وہ پیش پیش ہوں گے۔ نہ انھیں راضی رکھنا سہل ہے اور نہ انھیں تباہ کرنا آسان۔ ایسی صورت میں ادھر بغاوت شروع ہوئی اور ادھر بوریا بستر سنبھالنے کی نوبت آئی۔

اب اگر دارا[1] کی حکومت کی نوعیت پر غور کیا جائے تو وہ ترکوں کی حکومت سے بہت ملتی جلتی نظر آئے گی۔ اس لئے سکندر کو اس کے ساتھ جنگ میں اپنی پوری قوت صرف کرنی پڑی۔ لیکن جب فتح ہوگئی اور کچھ ہی عرصہ بعد دارا کا انتقال بھی ہوگیا تو بیان کردہ اسباب کی بنا پر سلطنت ایران پر سکندر کی نہایت مستحکم حکومت قائم ہوگئی۔ اگر سکندر کے جانشین آپس میں متحد رہتے تو

---

[1] دارا سوم ۳۳۶ تا ۳۳۰ ق۔م۔ جس نے سکندر اعظم کے مقابلہ پر شکست کھائی

اطمینان کے ساتھ ایران پر حکومت کر سکتے تھے۔ اس لئے کہ پوری قلمرو میں سوائے ان ہنگاموں کے جو خود ان جانشینوں کے پیدا کئے ہوئے تھے اور کوئی ہنگامے برپا نہیں ہوئے۔

لیکن ریاست فرانس کی مانند ہو تو ایسی پرامن حکومت ممکن نہیں۔ اسی سبب سے اسپین۔ فرانس اور یونان میں اہل روما کو آئے دن بغاوتوں کا سامنا رہتا تھا۔ ان ملکوں میں جب تک بہت سی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کی یاد لوگوں کے دلوں میں باقی رہی اہل روما کو اطمینان نصیب نہ ہوا۔ البتہ جب سلطنت روما کی قوت اور زمانہ دراز تک اس سلطنت کے قیام کی بدولت یہ یاد دلوں سے مٹ گئی تو پھر اہل روما کے سوا اور کوئی حکومت کا دعویدار نہ رہا۔ بعد میں جب خانہ جنگی شروع ہوئی تو ان صوبوں میں جس کا جہاں اثر تھا اس نے وہاں کی ایک جماعت کو اپنا شریک بنایا اور اسے میدانِ جنگ میں لا کھڑا کیا[1]۔ وجہ یہ تھی کہ پرانے بادشاہوں کی نسل ختم ہو چکی تھی۔ اور اب سوائے اہل روما کے اور کوئی تخت کا دعویدار نہ تھا۔ پس اگر ان باتوں کو ذہن میں رکھا جائے تو

---

[1] چنانچہ فرانس نے سیزر کا ساتھ دیا۔ اور ہسپانیہ اور یونان نے پامپی کا۔

یہ کوئی تعجب کی بات نہیں معلوم ہوگی کہ سکندر تو ایشیا
قابض رہا مگر دوسرے بادشاہ مثلاً پیریوس وغیرہ کو
مقبوضات برقرار رکھنے میں ہزار مشکلیں پیش آئیں۔ فاتحو
کے حسن تدبیر کی کمی یا زیادتی کا اس سے تعلق نہ تھا۔ اصل
وجہ تھی حالات کا فرق و اختلاف۔

# باب ۵

## ایسے شہروں اور ریاستوں پر جو فتح ہونے سے پہلے اپنے قوانین کے ماتحت رہے ہوں کیونکر حکومت کی جاسکتی ہے؟

نئی فتح کی ہوئی ریاستیں اگر آزادی کی خوگر ہوں اور خود اپنے قوانین کے ماتحت رہ چکی ہوں تو انہیں قابو میں رکھنے کی تین صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ انہیں بالکل تباہ و برباد کر دیا جائے۔ دوسری یہ کہ بادشاہ خود وہاں جاکر رہے۔ اور تیسری یہ کہ اگر تھوڑے سے روپے سے فاتح کی تسلی ہو جائے تو وہ یہ کر سکتا ہے کہ وہاں پرانے قوانین جاری رہنے دے اور ان پر حکومت کرنے کے لیئے ایک مجلس بنا دے جس میں چند ایسے افراد ہوں جو فاتح کے مفاد کا خیال رکھیں اور رعایا کو راضی اور تابعدار رکھیں۔ یہ حکومت فاتح کی قایم کی ہوئی ہوگی اور اس کے ارکین کو یہ معلوم ہوگا کہ خود ان کی حیثیت فاتح کی رہین منت ہے اور فاتح کی عنایت اور اختیار کے بغیر ان کی حکومت کا قیام نا ممکن۔ اس لیئے

وہ فاتح کی عملداری برقرار رکھنے میں ہر طرح کی کوشش کریں گے۔ جو شہر ایک زمانہ تک آزاد رہا ہو اسے قبضہ میں رکھنے کی سب سے آسان ترکیب یہی ہے کہ اسی کے باشندوں سے مدد لی جائے، ورنہ انتظام درہم برہم ہو جائے گا۔ اہل اسپارٹا اور اہل روما کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ اہل اسپارٹا نے ایتھنس اور تھیبیز پر قبضہ کیا[1]۔ تو اپنی پسند کی امرا کی حکومت قایم کی، مگر اس کے باوجود دونوں شہر اُن کے ہاتھ سے نکل گئے[2]۔ اہل روما نے کاپوا، کارتھیج اور نمانیتہ کو قبضہ میں رکھنے کے لئے انھیں تباہ کیا اور اس طرح انھیں اپنے قبضہ میں رکھ سکے۔ بعد میں جب انہوں نے یونان پر قبضہ جمانے کے لئے اہل اسپارٹا کی تقلید کی اور اہل یونان کی آزادی اور قوانین برقرار رکھتے تو انھیں ناکامی ہوئی۔ اور نتیجہ یہ ہوا کہ کئی شہروں کو قبضہ میں رکھنے کے لئے پہلے

---

[1] پیلوپونیسی جنگ کے بعد اہل اسپارٹا نے ایتھنس میں ۴۰۴ ق۔م میں ۳۰ جابروں کی حکومت قایم کی جسے ۴۰۳ ق۔م میں تھریسی بولس نے برباد کیا۔

[2] ۳۸۲ ق۔م میں اہل اسپارٹا نے تھیبیز پر جو چند سری حکومت قایم کی اس کا خاتمہ ۳۷۹ ق۔م میں پیلوپیڈس اور اپیامننڈس کے ہاتھوں ہوا۔

انھیں تباہ کرنا پڑا[1]۔ اور جہاں تک مجھے معلوم ہے یہی سب سے زیادہ موثر تدبیر ہے، جو کوئی کسی ایسے شہر کو فتح کرے جو آزادی کا مزہ چکھ چکا ہے اور اسے تباہ نہ کرے تو یہ اس کی بڑی بھاری غلطی ہے۔ اس غلطی کا نتیجہ خود اس کی تباہی کی شکل میں نمودار ہونا لازمی ہے بات یہ ہے کہ جب کبھی شہری بغاوت پر آمادہ ہوتے ہیں تو وہ ہمیشہ اسی لفظ آزادی اور اپنے آباؤ اجداد کے قوانین کو لیکر اٹھتے ہیں جن کو نہ تو وقت بھلا سکتا ہے اور نہ اچھا سلوک۔ ضروری ہے کہ ہر قسم کی احتیاط کی جائے اور ہر قسم کا بند و بست۔ ایسے علاقے کے باشندوں کو جس طرح بھی ہو متحد نہ ہونے دینا چاہئے۔ ایسا انتظام کرنا چاہئے کہ وہ منتشر رہیں۔ اگر یہ نہ ہو تو ان میں پرانے حقوق کی یاد کبھی نہ مٹ پائے گی اور ہر موقع پر وہ ان حقوق کو دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔ پیسا کی مثال ہمارے سامنے ہے[2]۔ گو وہ مدتوں

---

[1] مثالیں ہیں کارنتھ کی تباہی (۱۴۶ ق۔م) اور تھیبیز کی (۳۳۵ ق۔م)

[2] اہل فلورنس نے ۱۴۰۶ء میں پیسا کو بذریعہ خرید حاصل کیا لیکن بہت سی مصیبتوں اور جنگوں کے بعد اسے زیر کر پائے۔ ۱۴۹۴ء میں جب چارلس ہشتم نے اطالیہ پر حملہ کیا تو پیسا نے آزادی حاصل کر لی۔ ۱۵۰۹ء میں فلورنس نے دوبارہ پیسا کو فتح کیا۔

اہل فلورنس کے ماتحت رہا۔ مگر ان شہروں یا صوبوں کی حالت بالکل مختلف ہوتی ہے جو ایسے بادشاہ کے ماتحت رہے ہوں جس کی نسل نیست و نابود ہو چکی ہو۔ مانا کہ وفاداری ان کے رگ و ریشہ میں سرایت کر چکی ہوتی ہے مگر جب پرانے شاہی خاندان کا ایک بھی رکن انہیں ڈھونڈے نہیں ملے تو وہ کیا کریں۔ ہوتا یہ ہے کہ وہ آپس میں سے کسی ایک شخص پر متفق نہیں ہو پاتے اور بغیر بادشاہ کے وہ اپنے لئے آزادی کی زندگی ممکن نہیں خیال کرتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ آسانی سے بغاوت پر آمادہ نہیں ہوتے اور نیا بادشاہ انہیں آسانی سے خوش کر سکتا ہے۔ اور اس صورت میں ان کی طرف سے کامل اطمینان ہو سکتا ہے۔ مگر جمہوریتوں میں لوگوں میں زیادہ زندگی ہوتی ہے، ان کی نفرت زیادہ گہری اور ان کے انتقام کی آگ زیادہ تابناک ہوتی ہے قدیم آزادی کی یاد انہیں خاموش نہیں رہنے دیتی، اور بھلا کیسے خاموش رہنے دے۔ لہٰذا سب سے زیادہ موثر طریقہ یہی ہے کہ فاتح یا تو انہیں تباہ و برباد کر دے یا پھر انہیں میں بود و باش اختیار کرے۔

# باب ۶

## ان بادشاہتوں کے بارے میں جو اپنی صحیح تدبیر اور زور بازو سے حاصل کی گئی ہوں

یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ نئی حکومتوں کے بیان میں خواہ وہ بادشاہتیں ہوں خواہ جمہوریتیں۔ میں بڑی بڑی عظیم الشان مثالیں پیش کرتا ہوں۔ اصل بات یہ ہے کہ انسان اکثر انہیں راستوں پر گامزن ہوتا ہے جنہیں پہلے سے دوسرے لوگ اختیار کر چکے ہوتے ہیں اور جب وہ کوئی بڑا کام کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو اس کے پیش نظر کوئی نہ کوئی نمونہ ہوتا ہے پوری پوری برابری نہ ہوسکے تو نہ ہو اور وہ کمال جس کے حاصل کرنے کی خواہش ہے نہ حاصل ہو تب بھی کوئی مضائقہ نہیں مگر عقلمند آدمی کا شیوہ یہی ہونا چاہیئے کہ اپنے سامنے ایسی بڑی بڑی شخصیتوں کو بطور نمونہ کے رکھے جنہیں کسی بڑے کام میں غیر معمولی کامیابی نصیب ہوئی ہو۔ اس غرض سے کہ اگر ان جیسا کمال نہ بھی حاصل ہو تب بھی اس کا کچھ نہ

کچھ اثر ضرور رہو گا۔ تجربہ کار تیر انداز جب یہ دیکھتے ہیں کہ آماجگاہ بہت فاصلہ پر ہے تو چونکہ انہیں اپنی کمان کی قوت کا اندازہ تو ہوتا ہی ہے اور انہیں یہ بھی اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ وہ تیر کہاں تک پھینکتی ہے، اس لئے وہ اپنا نشانہ ذرا اونچا باندھتے ہیں۔ اس لئے نہیں کہ اس اونچائی پر تیر پھینکنا مقصود ہوتا ہے بلکہ اس لئے کہ اس ترکیب سے تیر ٹھیک نشانہ پر جا کر بیٹھتا ہے۔

چنانچہ ایسی ریاستوں کو قابو میں رکھنا جو حال میں کسی نئے بادشاہ نے حاصل کی ہوں، اس بادشاہ کی دانشمندی کے اعتبار سے کم یا زیادہ دقت طلب ہوگا۔ معمولی حیثیت سے بڑھ کر بادشاہ بننا کوئی معمولی بات نہیں۔ اس کے لئے شرط ہے غیر معمولی اوصاف یا خوبی قسمت اور دونوں ہوں تو کیا کہنا۔ پھر تو مفتوحہ علاقے کو قبضے میں رکھنا بہت ہی آسان ہے۔ مگر یاد رہے کہ کامیاب بادشاہ وہی ہیں جنہوں نے اپنی قسمت پر بہت زیادہ اعتماد نہیں کیا۔ بادشاہ کی دقتوں میں اس سے بھی کمی ہو جاتی ہے اگر وہ دوسرے مقبوضات نہ ہونے کی وجہ سے اپنی نئی ریاست میں مستقل قیام کرنے پر مجبور رہو۔

جو بادشاہ اپنی خوش قسمتی کی بدولت نہیں بلکہ اپنی لیاقت کی بنا پر اس منصب تک پہونچے ان میں خاص طور پر مشہور اور افضل میری رائے میں یہ ہیں:۔ حضرت موسیٰؑ

سائرؔس، رومولوس، تھیسیوس، وقس علیٰ ہذا۔ گو یہ مناسب ہوگا کہ حضرت موسیٰؑ کو ان میں شامل نہ کیا جائے اس لئے کہ وہ خدائے تعالیٰ کے احکام کی تعمیل کرانے آئے تھے۔ مگر نہیں، ان کا ذکر ضروری ہے، اور نہیں تو اس وجہ سے کہ وہ ان اوصاف کے مالک تھے جن سے وہ خدائے تعالیٰ سے ہمکلام ہونے کے قابل ہوئے۔ لیکن اگر ہم سائرؔس کو لیں یا دوسرے فاتحوں اور سلطنتوں کے بانیوں کو تو معلوم ہوگا کہ وہ سب نہایت غیر معمولی الشان تھے۔ اور ہم ان کی زندگی اور کارناموں پر نظر دوڑائیں گے تو ان میں اور حضرت موسیٰ میں۔ جن کا معلم خدائے برحق تھا کوئی خاص فرق دکھائی نہ دے گا۔ اور ان کی زندگی اور ان کے اعمال پر نظر ڈالنے سے صرف یہی پتہ چلے گا کہ ان کی خوبیٔ قسمت بس اتنی تھی کہ انھیں کام کرنے کا موقع ملا۔ جو مواقع ہاتھ آئے ان سے انہوں نے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ ان مواقع کے بغیر ان کی دماغی قوتیں رائیگاں جاتیں، لیکن ان میں قابلیت نہ ہوتی تو وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے اور موقع نکل جاتا۔ چنانچہ حضرت موسیٰ کے لئے ضروری تھا کہ بنی اسرائیل مصریوں کی غلامی اور مظالم کا شکار رہوں کہ اسی صورت میں غلامی

سے نجات حاصل کرنے کی خاطر انہیں حضرت موسیٰؑ کی
قیادت تسلیم ہو سکتی تھی۔ اسی طرح یہی مناسب تھا کہ رومولس
البا میں نہ رہ پائے اور پیدائش کے ساتھ ہی خطرات سے
دوچار ہو تاکہ شہر روما کا بادشاہ اور بانی بن سکے۔
سائرس کے لئے ضروری تھا کہ اہلِ فارس میدیوں کی
حکومت سے بیزار ہوں اور میدی ایک عرصہ سے امن و
سلامتی کی زندگی گذارنے کی وجہ سے کمزور ہو چکے ہوں
اور ان میں نسوانیت آچکی ہو اسی طرح تھیسیوس کو اپنے غیر
معمولی اوصاف کے اظہار کا موقع نہ ملتا اگر ایتھنس کے لوگ
غیر متحد اور منتشر نہ ہوتے۔ لیکن اگر ایک طرح وہ خوبیِ قسمت
سے ان مشاہیر کو یہ مواقع ملے تو دوسری طرف انھوں
نے ان مواقع سے اپنی قابلیت کی بدولت پورا پورا فائدہ
اٹھایا۔ اور اس سے ان کے وطن کی شہرت اور عظمت کو
چار چاند لگے۔

مندرجہ بالا مشاہیر کی طرح جو لوگ ایک ذریعوں
سے بادشاہت کے مرتبہ تک پہونچتے ہیں انھیں بادشاہت
حاصل کرنے میں جو بھی دشواریاں پیش آئیں، مگر اسے قابو
میں رکھنے میں کوئی خاص دقت نہیں ہوتی۔ بادشاہت کے
حصول میں دقتیں اس وجہ سے پیش آتی ہیں کہ حکومت کی

بنیاد رکھنے اور اپنی حفاظت کے لئے وہ اس بات پر مجبور ہوتے ہیں کہ نئے قوانین جاری کریں اور نئے ادارے قائم کریں اور جدتوں کو رواج دینا بہت ہی نازک امر ہے۔ اس راہ میں خطروں کی گنتی نہیں اور اس میں کامیابی بہت ہی غیر یقینی ہے۔ ایسے بادشاہ کے وہ سب لوگ دشمن بن جاتے ہیں جو پرانے نظام کے ماتحت خوش حال تھے۔ رہے وہ جنھیں نئے نظام سے فائدہ پہونچتا ہے سو وہ اس کی مدافعت میں پوری پوری سرگرمی نہیں دکھاتے۔ اس سرد مہری کا سبب کچھ تو مخالفین کا خوف ہوتا ہے۔ جنھیں قانون کی پشت پناہی حاصل ہوتی ہے اور دوسرے یہ لوگ اکثر نئی چیزوں پر اس وقت تک اعتقاد نہیں لایا کرتے جب تک انھیں کچھ دنوں پرکھ نہ لیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب کبھی نئے نظام کے مخالفوں کو موقع ملتا ہے وہ پوری قوت کے ساتھ حملہ کرتے ہیں لیکن دوسرے مدافعت میں بے پرواہی سے کام لیتے ہیں اور اس طرح اپنے ساتھ بادشاہ کو بھی لے ڈوبتے ہیں۔

اس مسئلہ پر پوری طرح بحث کرنا مقصود ہو تو پہلے یہ معلوم کرنا چاہئے کہ نئی طرز کے موجد خود اپنی قوت بازو پر بھروسہ کر سکنے کے قابل ہیں یا دوسروں کے دست نگر۔

دوسرے الفاظ میں اپنے کام کو اختتام تک پہونچانے کے لیئے انہیں منت سماجت کی ضرورت ہے یا استعمال کرنے کے لیئے ان کے پاس قوت ہے۔ پہلی صورت میں ان کا حشر برا ہوتا ہے اور وہ کچھ بھی نہیں کرپاتے۔ لیکن اگر ان کا اپنے اوپر بھروسہ ہے اور وہ قوت سے کام لیتے ہیں تو انہیں شاید ہی کبھی ناکامی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تمام مسلح پیغمبروں کو کامیابی نصیب ہوئی اور غیر مسلح پیغمبروں کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ مندرجہ بالا اسباب کے علاوہ ایک اور سبب بھی ہے۔ عام طور پر لوگ متلون مزاج ہوتے ہیں۔ انہیں کسی چیز کی طرف مائل کرنا سہل سہی مگر اس پر قایم رکھنا مشکل ہے۔ اسی لیئے ضرورت ہوتی ہے کہ جب وہ ماننے سے انکار کریں تو انہیں زبردستی منوایا جا سکے۔ اگر حضرت موسیٰ، سائیروس، تھیسیوس، اور رومولس غیر مسلح ہوتے تو عرصہ تک اپنے احکام کی پابندی نہ کرا سکتے، جیسا کہ ہمارے زمانہ میں گیرولاموساوونارولا[1] کے ساتھ پیش آیا۔ ادھر لوگوں کے یقین میں تنزل آیا اور ادھر اس کے نئے اداروں کا خاتمہ ہوا۔ اس کے پاس ایسے ذرایع

---

[1] ۱۴۹۸ء میں ساوونارولا کو پوپ کے حکم سے فلورنس میں نذر آتش کیا گیا۔ قصور؟ بدھتی ہونا!

نہ تھے جن کی مدد سے وہ عقیدتمندوں کا یقین برقرار رکھ سکتا۔ اور جو معتقد نہ تھے انہیں اپنے حلقۂ ارادت میں لا سکتا۔ چنانچہ اس قسم کے افراد کو اپنے کام کی تکمیل میں دشواری ہوتی ہے۔ ان کی راہ میں طرح طرح کی مشکلات حائل ہوتی ہیں گو ان پر وہ اپنی قابلیت سے قابو پا سکتے ہیں۔ اور ایک دفعہ انہوں نے ان مشکلات پر قابو پالیا اور حاسدوں کو نیست و نابود کر دیا تو پھر ان کی قوت، سلامتی، عزت اور مرفہ الحالی میں کوئی شبہ نہیں رہتا۔

جو بڑی بڑی مثالیں میں نے اوپر پیش کی ہیں ان میں ایک اور مثال کا اضافہ کرتا ہوں۔ یہ اتنی اہم نہ سہی مگر ہے اسی قسم کی۔ مثال بہتر بن ہے، میری مراد سائراکوز کے بادشاہ ہیروؔ۵ سے ہے۔ یہ ایک معمولی شہری تھا، بڑھتے بڑھتے سائراکوز کا بادشاہ بن گیا۔ قسمت کا اس پر بس اتنا احسان تھا کہ اسے اپنا جوہر دکھانے کا موقع دیا۔ اہل سائراکوز مظلوم تھے۔ انہوں نے ہیرو کو اپنا سپہ سالار بنایا۔ پھر کیا تھا اس نے وہ وہ کارہائے نمایاں انجام دیے کہ اس کو بادشاہت سونپی گئی۔ معمولی شہری تھا تب

---

۵ ہیرو دوم۔ ۳۰۶ (؟) تا ۲۱۶ ق۔ م۔ ~~۲۶۵ تا ۲۶۹ ق۔ م~~ سائراکوز کا بادشاہ تھا۔

بھی بڑی خوبیوں کا مالک تھا چنانچہ ایک ہم عصر مصنف لکھتا ہے کہ سوائے ملک کے اس کے پاس سبھی کچھ ہے جو بادشاہ کے پاس ہونا چاہیئے۔ اس نے پرانی فوج کو ایک طرف کرکے نئی فوج کی تنظیم کی۔ قدیم سیاسی اتحادوں کو ترک کیا اور نئے ساتھی بنائے۔ اس کی فوج بھی اپنی تھی اور ساتھی بھی اپنے۔ ان بنیادوں پر وہ اپنی خواہش سے مطابق عمارت کھڑی کر سکتا تھا۔ اسے حکومت حاصل کرنے میں بڑی دقتیں پیش آئیں مگر اسے برقرار رکھنے میں ذرا بھی نہیں۔

# باب ۷

## نئی بادشاہتیں، دوسروں کی مدد اور اپنی خوش نصیبی سے حاصل کی ہوئی

جو افراد معمولی حیثیت سے بڑھ کر محض اپنی خوش نصیبی کی بنا پر بادشاہ بن جاتے ہیں انھیں حکومت کے حاصل کرنے میں تو کوئی دقت نہیں ہوتی لیکن اسے قایم رکھنے میں بڑی مشکلات کا سامنا کرنا ہوتا ہے۔ راستہ میں قدم بڑھاتے وقت کوئی بھی رکاوٹ محسوس نہیں ہوتی اور وہ اپنی منزل مقصود کی طرف دوڑتے ہوئے چلے جاتے ہیں، البتہ جب وہاں پہونچ جاتے ہیں تب انھیں مشکلات آن گھیرتی ہیں۔ اس قسم میں وہ بادشاہ شامل ہیں جنھیں ریاستیں یا روپے کے بدلہ ملتی ہیں یا عطا کرنے والے کی نوازش سے۔ چنانچہ یونان میں بارہا یہی ہوا۔ آیونا اور ہیلز پانٹ کے شہروں میں دارا نے اپنی حفاظت اور عظمت کی خاطر بادشاہتیں قایم کیں۔ یہی مثال ان

شہنشاہوں پر بھی عاید ہوتی ہے جو فوج میں خرابی پھیلا کر اس رتبہ کو پہونچے۔ اس طرح کے بادشاہوں کا دارومدار بس ان اشخاص کی خوشنودی اور خوش نصیبی پر ہوتا ہے جن کے طفیل میں بادشاہت حاصل ہوئی ہو۔ اور یہ دونوں بہت ہی غیر مستقل اور بے ثبات ہیں۔ ایسے بادشاہوں میں اس علم کی بھی کمی ہوتی ہے اور اس طاقت کی بھی جو اس مرتبہ پر فائز ہونے کے لئے ضروری ہیں۔ جہاں تک علم کا تعلق ہے اگر یہ بادشاہ غیر معمولی خوبیوں اور قابلیت کے مالک ہوں تب تو اور بات ہے ورنہ ان سے یہ توقع رکھنا ٹھیک نہیں کہ وہ ہمیشہ معمولی زندگی گزارتے رہنے کے باوجود دوسروں پر حکومت کرنا جانتے ہوں گے۔ رہی طاقت تو اُن کے پاس ہمدرد اور وفادار فوجیں نہیں ہوتیں۔

پھر عالم فطرت کی تمام اُن اشیاء کی طرح جنھیں پیدا ہونے اور بڑھنے میں دیر نہیں لگا کرتی، جو ریاستیں یکایک معرض وجود میں آتی ہیں ان کی جڑیں کھوکھلی اور اُن کے تعلقات غیر مستحکم ہوتے ہیں۔ وہ آندھی کے ایک جھونکے کی بھی تاب نہیں لا سکتیں۔ البتہ یہ اور بات ہے کہ جنھیں قسمت کے زور سے اچانک بادشاہت ملے اُن میں جلدی سے سیکھنے کی قابلیت بھی پیدا ہو جائے کہ اس کو کیونکر برقرار رکھیں۔

اور اس مرتبے پر پہنچنے کے بعد وہ بنیا دیں رکھیں جو دوسرے اس منزل پر پہنچنے سے پہلے ڈال چکے ہوتے ہیں۔

اب میں بادشاہ بننے کے ان دونوں طریقوں کی ایک ایک مثال زمانہ قریب سے دیتا ہوں۔ یعنی ایک تو بہادری کے ذریعہ بادشاہ بننے کی اور دوسرے قسمت کی یاوری سے۔ مثالیں ہیں " فرانسسکو اسفورزا اور " سیزارے بورژیا" کی۔ فرانسسکو مناسب ذرائع اختیار کرکے اور اپنی غیر معمولی حیثیت سے بڑھ کر مائلان کا نواب (ڈیوک) بن گیا۔ حکومت حاصل کرنے کے لئے اُسے خون پسینہ ایک کرنا پڑا۔ مگر اُسے برقرار رکھنے میں ذرا بھی دشواری نہیں ہوئی۔ برخلاف اس کے " سیزارے بورژیا" کی مثال ہے۔ جسے عرف عام میں " ڈیوک وا لنٹینو" کہا جاتا ہے۔ اُسے بادشاہت اپنے باپ کی بدولت ملی۔ اور جب باپ کا زوال ہوا تو بیٹے کی بادشاہت بھی جاتی رہی۔ حالانکہ اس ریاست میں قدم جمانے کے لئے جو اُسے کسی اور کی طاقت اور خوش نصیبی کی بدولت حاصل ہوئی تھی اس نے وہ سارے جتن کئے جو ایک دانشمند اور قابل شخص کر سکتا ہے۔

یہ سب اس لیئے ہوا جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں، کہ جو کوئی شروع میں عمارت کی بنیاد نہیں رکھتا تو

اگر وہ غیر معمولی آدمی ہے تو ممکن ہے کہ بعد میں بنیاد رکھنے میں کامیاب ہو جائے۔ مگر اس میں معمار کو دقتیں پیش آئیں گی۔ اور عمارت کے لئے خطرہ رہے گا۔ اب اگر ہم ان مختلف تدبیروں پر غور کریں جو ڈیوک والنٹینو نے اختیار کیں تو ہمیں اُن بنیادوں کی وسعت کا اندازہ ہوگا جن پر وہ آیندہ اپنی قوت کی عمارت کھڑی کرنی چاہتا تھا۔

میرے خیال میں ان تدابیر پر غور کرنا ہرگز فضول نہیں۔ اس لئے کہ میری دانست میں نئے بادشاہ کے لئے اور کوئی نصائح ان سے زیادہ مفید ثابت نہیں ہو سکتے۔ اب رہا یہ کہ ان تدابیر سے اس کو کوئی فائدہ نہیں ہوا تو اس میں اس کا کوئی قصور نہیں تھا۔ صرف اس کی غیر معمولی اور انتہائی بدنصیبی تھی۔

الکزانڈر ششم اپنے بیٹے ڈیوک کو بادشاہت دلانا چاہتا تھا۔ مگر راہ میں بہت سی فوری اور بعید دقتیں تھیں۔ پہلی دقت یہ تھی کہ اس کے خیال میں یہ ممکن نہ تھا۔ کہ اُسے کسی ایسے علاقے کا بادشاہ بنایا جائے جو کلیسا کے مقبوضات میں سے نہ ہو۔ اور اگر وہ اس کے لئے ایسا علاقہ لیتا جو کلیسا کی ملک ہوتا تو اُسے یہ معلوم تھا کہ میلان کا ڈیوک اور اہل وینس جن کے ماتحت فائنزا اور ریمینی پہلے سے تھے اس پر کسی طرح راضی نہ ہوں گے۔ اس کے

علاوہ اس کی آنکھوں کے سامنے اطالیہ کے وسائل جنگ تھے خاص طور پر وہ جن سے اُسے مدد ملنے کا امکان تھا۔ مگر یہ وسائل اُن لوگوں کے ہاتھوں میں تھے جو پوپ کی بڑھتی ہوئی طاقت سے خوفزدہ تھے۔ مراد ہے آرسینی، کالونینی[1] اور ان کے حامی موالیوں سے، ان پر اعتماد ممکن نہ تھا۔ پوپ کے لئے ضروری تھا کہ اس صورتِ حالات کو یکسر بدل ڈالے۔ اور اطالیہ کی ریاستوں کو کشت و خون میں مبتلا کرے تاکہ وہ کم ازکم اُن کے ایک حصّے پر اطمینان سے قابض ہو سکے۔ یہ بات اس کے لئے اور بھی آسان ہو گئی جب اُس نے اہل وینس کو بعض دوسرے اسباب کی بنا پر فرانسیسیوں کو دوبارہ اطالیہ میں لانے کی سازش کرتے پایا۔ نہ صرف اس منصوبے کی اُس نے مخالفت نہ کی بلکہ شاہ لوئیز کے پہلے نکاح کو فسخ کر کے اُسے اور تقویت بخشی۔

چنانچہ شاہ لوئیز اہل وینس کی درخواست پر اور پوپ الکزانڈر کی مرضی سے اطالیہ میں داخل ہوا۔ وہ ادھر مائلان پہونچا اور ادھر پوپ نے روماناکے خلاف مہم کے لئے اُس سے فوجی اِمداد حاصل کی اور صوبہ رومانا نے فرانسیسی طاقت کے رعب میں آکر فوراً اطاعت قبول

---

[1] روما کے بڑے جاگیردار

کرلی۔ اس طرح روماناپر قبضہ کرنے اور کالوینی کو شکست دینے کے بعد ڈک دا لنشینو اس راستے پر آگے چلنا اور اپنے مقبوضات کو اور وسعت دینا چاہتا تھا۔ مگر دو باتوں نے اس کو روکا۔ ایک تو اس کی اپنی فوجوں کی مشتبہ وفاداری اور دوسرے فرانس کی مخالفت۔ اسے خوف تھا کہ آرسینی کی افواج جن سے اُس نے اپنا کام نکالا تھا کہیں اُسے دھوکا نہ دیں اور نہ صرف اور مقبوضات حاصل کرنے میں رکاوٹ ڈالیں بلکہ الٹا اس سے وہ بھی نہ چھین لیں جو وہ حاصل کر چکا تھا۔ اور کہیں شاہ فرانس بھی ایسا ہی نہیں کرے۔ آرسینی پر بھلا وہ کیسے بھروسہ کرتا جب کہ وہ دیکھ چکا تھا کہ فائنزا[1] پر قبضہ کرنے کے بعد جب اس نے بولانا پر چڑھائی کی تو آرسینی نے مہم میں کتنی بے دلی سے ساتھ شرکت کی۔ شاہ فرانس کے دل میں جو کچھ تھا اُسے بھی وہ اسی وقت خوب سمجھ گیا جب ار بینو[2] کی ریاست پر قبضہ کرنے کے بعد اس نے ٹسکنی پر حملہ کرنے کی ٹھانی اور جس سے لوئیز نے اُسے روکا۔ اسی موقع پر ڈیوک نے پکا ارادہ کر لیا کہ وہ آیندہ دوسروں کی طاقت پر بھروسہ

---

[1] ۲۵۔ اپریل ۱۵۰۱ء کا واقعہ ہے۔
[2] ۲۱۔ جون ۱۵۰۲ء۔

نہ کرے گا۔ اس نے جو پہلا قدم اُٹھایا وہ یہ تھا کہ رومانیں آرسینی اور کالوبینی کے جتھوں کو کمزور کیا۔ ان کے پیرووں میں جو شرفا تھے انھیں اس طرح اپنے ساتھ ملایا کہ انھیں اپنے شرفاء میں شریک کیا۔ انھیں معقول معاوضہ دیا اور ان کی لیاقت کے مطابق انھیں عہدے دیئے اور حکومت عطا کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چند مہینوں کے بعد ان کے جو تعلقات ان جماعتوں سے تھے وہ ختم ہو گئے۔ اور اُن سب کی اُمیدوں کا مرکز بس ڈیوک بن گیا۔

پھر وہ آرسینی کے اکابر کا خاتمہ کرنے کے لئے موقع کی تاک میں رہا۔ خاندان کولونا کے اکابر کو تو پہلے ہی تتر بتر کر چکا تھا۔ اور جب اچھا موقع آیا تو اس نے اس سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ اس لئے کہ جب آخرکار آرسینی اس نتیجہ پر پہنچے کہ ڈیوک اور کلیسا کی عظمت اُن کی تباہی کے مترادف ہے تو انہوں نے پروژیا کے علاقے کے اندر ماژیونؔ میں ایک کونسل منعقد کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اربینو میں بغاوت ہوئی، رومانا میں ہلچل مچی، ڈیوک کے لئے اور بھی بہتیرے خطرے پیدا ہو گئے[2]۔ مگر ان سب پر اس نے

---

[1] ۹ اکتوبر ۱۵۰۲ء کو یہ واقعہ پیش آیا۔

[2] اس کی افواج نے ۰ اکتوبر ۱۵۰۲ء کو ارسینی کے ہاتھوں شکست کھائی۔

فرانس کی مدد سے قابو پا لیا۔ جب اُس کی دھاک پھر سے بیٹھ گئی اور فرانسیسی یا دوسری بیرونی امداد پر اُسے بھروسہ نہ رہا تو اس خیال سے کہ کہیں کھلم کھلا مقابلہ نہ کرنا پڑے وہ داؤ پیچ پر اتر آیا۔ اور اُس نے اپنی چالوں کو ایسی خوبی سے پوشیدہ رکھا کہ سنورپاؤلو[1] کے توسط سے (جس پر اس نے ہر قسم کے لطف و کرم کی بارش کی اور جسے خلعتیں، روپیہ اور گھوڑے سبھی کچھ عطا کئے) آرسینی کو راضی کر لیا۔ یہاں تک کہ اپنی سادگی سے انہوں نے اپنے آپ کو سینی گالیا[2] میں اس کے حوالے کر دیا۔ جب لیڈر ختم ہو گئے اور اُن کے پیرو اس کے دوست بن گئے۔ تو ڈیوک کی آیندہ عظمت کی کافی مضبوط بنیادیں پڑ گئیں اس لئے کہ اربینو کے ساتھ ساتھ اُس کے ماتحت روماناکا تمام علاقہ تھا۔ اور ان ریاستوں کی پوری آبادی کے دلوں میں اُس نے گھر کر لیا تھا۔ خاص طور پر روما کے لوگوں کے دلوں میں جو اب بہت خوش حال تھے۔

اس کے عمل کا ہر حصہ چونکہ خاص طور پر توجہ اور

---

[1] پاؤلو ۲۵۔ اکتوبر ۱۵۰۲ء کو سینزارسے بورڑیا سے گفت وشنید کرنے کے لئے امولا آیا۔

[2] ۳۱ دسمبر ۱۵۰۲ء کو یہ سب قتل کر دیے گئے۔

تقلید کے قابل ہے - اس لئے میں خاموشی کے ساتھ اس پر نہیں گذرنے کا۔ جب ڈیوک نے روماناپر قبضہ کیا۔ تو اس پر نالائق حاکموں کی حکومت تھی۔ جن کے پیش نظر رعایا کا مفاد نہیں بلکہ جن کا مقصد رعایا کو لوٹنا تھا، اور جو اتحاد کی بجائے نفاق پیدا کرنا چاہتے تھے۔ نتیجہ یہ تھا کہ ملک میں آئے دن ڈکیتی، فساد اور ہر طرح کی زیادتیاں ہوتی رہتی تھیں۔ ان حالات میں اس نے یہ طے کیا کہ ملک میں امن و امان قایم کرنے۔ ملک کو مطیع و فرماں بردار بنانے کے لئے ضروری تھا کہ اچھی حکومت قایم کی جائے۔ چنانچہ اس نے مسٹر رامیرو ڈورکو[1] جو نہایت درشت اور مستعد آدمی تھا حاکم بنایا۔ اور اُسے کامل اختیارات تفویض کئے۔ اس نے تھوڑے ہی عرصہ میں نہایت کامیابی کے ساتھ ملک میں امن و امان قایم کر دیا۔ لیکن جب بعد میں اُسے یہ خوف ہوا کہ اتنے غیر محدود اختیارات سے نقصان کا اندیشہ ہے تو ڈیوک نے فیصلہ کیا کہ اس کی اب ضرورت باقی نہیں رہی اور اس نے صوبہ کے مرکز میں ایک عدالتی مجلس ایک لائق صدر کے ماتحت قایم کی جس میں ہر شہر کو اپنے وکیل کے ذریعہ نیابت حاصل تھی۔ اُسے یہ اچھی طرح

---

[1] اصل نام تھا ریمیرس دے لورکوا۔

معلوم تھا کہ گذشتہ مظالم کی وجہ سے لوگوں میں اُس کے خلاف سخت نفرت پیدا ہو گئی تھی۔ اب اس کو دور کرنے کے لئے اور لوگوں کی خوشنودی حاصل کرنے کی خاطر اس نے یہ ظاہر کرنا شروع کیا کہ ان پر جو زیادتیاں ہوئی تھیں اُن کا ذمہ دار وہ خود نہیں بلکہ اس کا نائب تھا۔ اس بہانہ سے فائدہ اٹھا کر ایک دن اُس نے رامیرو کا سر تن سے جدا کروا دیا[1]۔ اور یہی نہیں بلکہ مع تختہ اور خون آلود کلہاڑی کے سزینا میں اُسے سربازار مشتہر کیا۔ عجب وحشیانہ منظر تھا جس سے عام لوگ مطمئن بھی ہوئے اور ہکے بکے بھی رہ گئے۔

آئیے اب پھر ہم اُس مضمون کی طرف لوٹیں جس سے ہم نے آغاز کیا تھا۔ ایک وقت آیا کہ ڈیوک کافی طاقتور اور ایک حد تک فوری خطروں سے محفوظ ہو گیا۔ وہ اس طرح کہ اُس کے پاس اپنی پسند کی فوجیں تھیں۔ اور رجن جن سے اُسے قرب میں ہونے کی وجہ سے خطرہ ہو سکتا تھا۔ وہ بڑی حد تک ختم کئے جا چکے تھے۔ اب غور کے قابل یہ بات تھی کہ اگر وہ مقبوضات کو بڑھانا چاہے۔ تو شاہ فرانس کی جانب کیا رویہ اختیار کرے۔ اس لئے کہ یہ تو وہ خوب جانتا تھا کہ شاہ لوئیز سے جو اپنی غلطی اچھی طرح پہچان

---

[1] ۲۶، دسمبر ۱۵۰۲ء

چکا تھا کسی قسم کی امداد کی توقع نہیں رکھی جا سکتی تھی۔ چنانچہ اس نے نئے ساتھیوں کی تلاش شروع کی۔ اور فرانسیسیوں کے ساتھ جو نیپلس میں ہسپانیوں کے خلاف جنگ کر رہے تھے، اس لئے کہ ہسپانی گاتا کا محاصرہ کئے ہوئے تھے، دورخی چال چلنے لگا۔ اس سے اس کا مقصد یہ تھا کہ فرانس کی طرف سے اپنی حفاظت کا انتظام کر لے۔ اور اگر الگزانڈر زندہ رہتا[1] تو اُسے اس میں جلد کامیابی بھی ہو جاتی۔

موجودہ ملکی معاملات میں اس کی حکمت عملی وہ تھی جو اوپر بیان ہوئی۔ رہا مستقبل کا مسئلہ، تو اُسے یہ ڈر تھا کہ کہ ممکن ہے کلیسا کا نیا سردار اس کا دوست نہ ہو۔ اور جو کچھ اسے الگزنڈر سے ملا تھا شاید اُسے چھیننے کی کوشش کرے۔ اس کا کاٹ کرنے کے لئے اس کے خیال میں چار تجویزیں آئیں۔ ایک' ان بڑے سارے کے تمام

---

[1] جب اپریل ۱۵۰۳ء میں فرانسیسیوں کو اس جنگ میں جو وہ نیپلس کو تقسیم کرنے کے لئے ہسپانیہ کے خلاف لڑ رہے تھے۔ شکستوں کا منہ دیکھنا پڑا تو سیزارے بورژیا نے تسکین حاصل کرنے کے لئے ہسپانیوں سے مدد حاصل کرنے کی کوشش کی، مگر ۱۸ اگست ۱۵۰۳ء کو الگزانڈر ششم کا انتقال ہو گیا۔

رشتہ داروں کو جن کی جائدادیں اُس نے ضبط کرلی تھیں نیست ونابود کرنا۔ تاکہ نئے پوپ کو مداخلت کا موقع ہی نہ ملے۔ دوسرے تمام شریف خاندان رومیوں کو اپنی طرف کرنا تاکہ جیسا کہ کہا جاچکا ہے ان کی مدد سے پوپ کی روک تھام کی جا سکے۔ تیسرے بڑے پادریوں کی مجلس (کالج آف کارڈینلس) کو اپنے تخت میں لانا۔ اور چوتھے اپنے والد کی موت سے پہلے اپنی حکومت اس طرح مستحکم کرنا کہ پہلے وار کا تن تنہا مقابلہ کرسکے۔

جب الکزانڈر کی موت واقع ہوئی تو ان چار مقاصد میں سے تین پورے ہوچکے تھے۔ اور چوتھا بس پورا ہوا چاہتا تھا۔ جن رؤسا، کی جائدادیں اُس نے غصب کی تھیں ان میں سے جن جن تک اُس کی پہونچ ہوئی اُنھیں اُس نے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اور بہت ہی تھوڑے بچ پائے۔ رومی شرفا کو اُس نے اپنے ساتھ ملالیا اور بڑے پادریوں کی مجلس میں اکثریت کو اپنا حامی بنا لیا۔ جہاں تک مزید فتوحات کا تعلق ہے وہ ٹسکنی پر قابض ہونا چاہتا تھا۔ پروژیا اور پیومبینو پر تو اس کا

---

[1] ۶ رجنوری ۱۵۰۳ء سے۔

[2] ۳ ستمبر ۱۵۰۳ء سے۔

قبضہ ہو ہی چکا تھا۔ اور پیسا کو بھی وہ اپنی حفاظت میں لے چکا تھا[1] اور اب چونکہ فرانس کی اُسے پرواہ نہیں تھی۔ اس لئے کہ فرانسیسیوں کو ہسپانی نیپلس سے نکال چکے تھے۔ اور اس طرح دونوں اُس کی دوستی حاصل کرنے کے خواہاں تھے۔ وہ پیسا پر کودپڑا۔ جب پیسا لے لیا تو لکا اور سینا کا سر تسلیم خم کرنا یقینی تھا۔ کچھ تو اہل فلورنس سے نفرت کی وجہ سے اور کچھ اُن کے خوف کے سبب۔ اور اہل فلورنس کی حالت کا ناگفتہ بہ ہونا لازمی تھا۔

پس اگر اُسے ان منصوبوں میں کامیابی ہوتی، جیسا کہ اُس سال ہو رہی تھی جس سال الگزنڈر کا انتقال ہوا تو اس کی طاقت اور شہرت اتنی بڑھ جاتی کہ پھر وہ اپنے بل بوتے پر اپنی جگہ قایم رہ سکتا تھا۔ اور دوسروں کی فوجوں اور مقدر پر اس کا دارو مدار نہ ہوتا۔ مگر سیزارے بورژیا کو تلوار میان سے نکالے پانچ ہی برس ہوئے تھے کہ الگزانڈر کا انتقال ہو گیا[2] جبکہ صرف روما نا کی

---

[1] سنہ ۱۵۰۰ء سے۔

[2] اصل میں ۱۴۹۸ء کے اخیر میں سیزارے بورژیا نے یہ جنگ شروع کی تھی اگرچہ وہ اگست ۱۴۹۸ء میں ڈیوک بن گیا تھا۔ الگزانڈر ششم کی موت اگست ۱۵۰۳ء میں واقع ہوئی۔

ریاست کا ٹھیک ٹھور رہ پایا تھا۔ اور باقی سب علاقے اتھل پتھل تھے۔ اور اس پر غضب یہ کہ نہایت ہی طاقتور فوجوں کے درمیان گھرے ہوئے تھے۔ اور حد درجہ کے بیمار و نزار تاہم ڈیوک ایسے جوش و خروش اور ہمت و عزم والا انسان تھا اور اس سے بھی اچھی طرح واقف کہ لوگوں کو یا تو کسی طرح راضی اور خوش رکھنا چاہئے یا انہیں بالکل پیس کر رکھ دینا چاہئے۔ نیز اس مختصر سے عرصہ میں اُس نے ایسی استوار بنیادیں ڈالی تھیں۔ کہ اگر یہ فوجیں اس کا پیچھا کرنے کے لئے نہ ہوتیں، یا پھر اُس کی صحت بہتر ہوتی تو وہ ضرور ہر شکل پر غالب آتا۔

جو بنیادیں اُس نے ڈالی تھیں ان کی مضبوطی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ روما نے ایک مہینے سے زیادہ اس کا انتظار کیا۔ اور نیم مردہ ہونے پر بھی روما میں کوئی اس کا بال بیکا نہ کر سکا۔ حالانکہ بالیونی، وتیلی اور آرسینی اس پر حملہ کرنے کے لئے آئے۔ مگر کسی نے اُن کا ساتھ نہ دیا۔ اور چاہے وہ اپنی پسند کے مطابق کسی کو پوپ

---

لہ ایک طرف گائیتا میں ہسپانوی افواج تھیں اور دوسری طرف روما میں فرانسیسی لشکر۔

لہ پروژیا پر ان کی حکومت تھی۔

نہ ہو اسکتا ہو۔ مگر اسی کے ساتھ یہ بھی ممکن نہ تھا کہ اس کی
مرضی کے خلاف کوئی پوپ منتخب ہو سکے۔ اگر الگزانڈر کی
موت کے وقت اُس کی صحت اچھی ہوتی تو پھر اس کے لئے
سب کچھ آسان تھا جس روز جولیس دویم پوپ منتخب ہوا[1]
اس روز سیزارے بورژیا نے خود مجھ سے کہا کہ اُس
نے ان تمام صورتوں پر غور کیا تھا جو اُس کے باپ کی
موت کے وقت پیش آسکتی تھیں اور ان سب کے مقابلے
کے لئے تدابیر سوچ رکھی تھیں۔ مگر جو چیز پہلے سے اس کے
ذہن میں نہیں آئی تھی وہ یہ تھی کہ جب اُس کے باپ کا انتقال
ہو گا تو وہ خود بھی بستر مرگ پر دراز ہو گا۔

ڈیوک کے ان تمام کاموں پر نظر ڈالی جائے تو
وہ قصور روا نہیں ٹھیرے گا۔ نہ صرف یہ بلکہ میرے
خیال میں تو مناسب ہو گا اگر جیسا کہ میں نے کہا ہے۔
اسے ان سب بادشاہوں کے سامنے بطور نمونہ کے
رکھا جائے جو اپنی خوش قسمتی سے اور دوسروں کی
امداد سے اس مرتبہ تک پہونچے ہیں۔ اس لئے کہ
اس کی اعلیٰ ہمت اور بلند حوصلگی کا یہی تقاضا تھا

---

[1] ۲۰ر اکتوبر ۱۵۰۳ء سے پکیا دیلی روما میں فلورنس کا سفیر تھا جو لیس
دوم یکم نومبر ۱۵۰۳ء کو پوپ کی حیثیت سے مسند نشین ہوا۔

وہ وہی کرے جو اس نے کیا۔ اور اگر اسے اپنے منصوبوں میں کامیابی نہیں ہوئی تو اس کی وجہ صرف اُس کے باپ کی کم عمری اور اس کی اپنی بیماری تھی۔ پس جو کوئی نیا نیا بادشاہ بنے اور اُس کا مقصد ہو دشمنوں کا قلع قمع کرنا، دوستوں کو خوش کرنا، زور سے یا چالبازی سے اپنا سکّہ جمانا، رعایا کے دلوں میں اپنا خوف اور محبت دونوں بٹھانا، سپاہیوں کو مطیع و فرماں بردار بنانا، جو اُسے نقصان پہنچانے کے قابل یا کسی سبب سے اُسے نقصان پہنچانے کے خواہشمند ہوں ان کو نیچا دکھانا، پرانے نظام کو بدل کر نئے نظام کی بنیاد ڈالنا، سختی کی جگہ سختی اور نرمی کی جگہ نرمی کرنا، دریا دلی اور فیاضی سے کام لینا، غیر وفادار فوجوں کو تباہ و برباد کر کے نئی فوجیں بھرتی کرنا، بادشاہوں اور راجاؤں سے اس طرح تعلقات رکھنا کہ وہ اگر مدد کریں تو پورے جوش و خروش کے ساتھ اور اگر مخالفت کریں تو احتیاط سے، تو اس مقصد کے لئے اس شخص کے کاموں سے بڑھ کر قابلِ تقلید مثال ملنا مشکل ہے۔

اس کا قصور صرف ایک تھا۔ جولیس دوم کا پوپ

کی حیثیت سے منتخب ہونا۔ اس کا یہ انتخاب ٹھیک نہ تھا۔
جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے وہ اپنی مرضی کا پوپ منتخب
نہ بھی کرا سکتا تو کم از کم وہ جسے نہ چاہتا اُسے منتخب
ہونے سے روک سکتا تھا۔ اور اُسے ایک ایسے بڑے
پادری کو کبھی پوپ نہیں بننے دینا چاہئے تھا جسے وہ نقصان
پہونچا چکا تھا۔ یا جو پوپ بننے کے بعد بجا طور پر اس
سے خائف ہوتا۔ اس لئے کہ خوف اُسی قدر خطرناک
دشمن ہے جس قدر ناراضگی۔ جن کو اُس نے ناراض کیا تھا
اُن کے نام علاوہ اوروں کے یہ ہیں۔ سان پیترواد ونکولا[1]
کولانا، سان تزیارژیو[2]، اور اسچانیو، جو باقی رہے اُن
میں سے :۔ امبوئزے اور رہسپانوی کارڈینلوں (پادریوں)
کے علاوہ (ہسپانوی کارڈینل تعلقات اور احسانات کی
وجہ سے اور روئن اس قوت کی وجہ سے جو اُسے فرانسیسی
قصر شاہی سے تعلقات کی بنا پر حاصل ہوئی) اور سب
پوپ بننے کے بعد بجا طور پر اس سے خائف ہوتے۔
ڈیوک کو اولاً ہسپانوی پوپ بنوانے کی کوشش کرنی

---

[1] اصل نام تھا ژیولیانو ویلا روویرا جو بعد میں پوپ جولیس دوم کے لقب سے مشہور رہا۔ [2] اصل نام رفائیلو ریاریو دی سوونا۔
[3] اس کا نیو اسفورزا ابن گیان گالیازو، ملان کے سابق ڈیوک کا بیٹا۔

چاہئے تھی۔ اس میں ناکامی ہوتی تو چاہئے تھا کہ روئن کے انتخاب پر راضی ہو جائے۔ بہرصورت سان پیترو اد وِنچولا کے انتخاب پر کبھی راضی نہ ہونا چاہئے تھا۔ جو کوئی یہ سمجھے کہ بڑے لوگ موجودہ احسانات کی وجہ سے پرانی شکایتیں بھلا دیتے ہیں وہ دھوکے میں ہے۔

اس انتخاب میں ڈیوک نے بڑی غلطی کا ارتکاب کیا۔ اور یہی غلطی آخر میں اس کے زوال کا باعث ہوئی۔

# باب ۸

## ان اشخاص کے بارے میں جو جرم کا ارتکاب کر کے بادشاہ بنے ہوں

خانگی حیثیت سے ترقی کر کے بادشاہ بننے کی دو صورتیں ایسی ہیں جن میں سے ایک بھی پورے طور پر شجاعت یا تقدیر کی طرف منسوب نہیں کی جا سکتی۔ اس لئے مناسب ہوگا اگر یہاں پر میں ان کا ذکر کروں۔ گو ان میں سے ایک پر جمہوریتوں کے تحت میں زیادہ تفصیل کے ساتھ بحث ہو سکتی ہے۔

جو صورتیں میرے پیش نظر ہیں وہ یہ ہیں۔ ایک وہ جب بادشاہت شرارت اور ارتکاب جرم سے حاصل کی جائے۔ اور دوسری وہ جب کوئی شخص دوسرے شہریوں کی عنایت سے بادشاہ بنے۔ میں پہلے طریقے کو دو مثالوں سے واضح کروں گا۔ ایک مثال زمانہ قدیم

سے لی گئی ہے اور دوسری زمانہ جدید سے، میں زیادہ تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔ جو کوئی ان مثالوں پر عمل کرنا چاہے گا اُس کے لیئے مختصر سا ذکر بھی کافی ہے۔

صقلیہ کا اگیتھوکلیز[1] نہ صرف یہ کہ شاہی خاندان سے تھا بلکہ وہ جن لوگوں میں سے تھا وہ یوں ہی تھے، ایرے غیرے نتھو خیرے یہ شخص ایک کمہار کا بیٹا تھا۔ اور اس کی زندگی طرح طرح کی برائیوں کا مجموعہ تھی لیکن اس کے باوجود اس میں ایسی دماغی اور جسمانی خوبیاں تھیں کہ جب اس نے سپاہیانہ زندگی اختیار کی تو معمولی سپاہی کی حیثیت سے ترقی کر کے سائراکیوز کا سپہ سالار بن گیا۔ جب یہ حیثیت مستحکم ہو گئی تو اُس نے بادشاہ بننے کی ٹھان لی اور جو کچھ اُسے دوسروں کی رضا و رغبت سے ملا تھا اُسے اپنی قوت سے حاصل کرنے کا فیصلہ کیا تاکہ کسی کا اس پر کچھ احسان نہ رہے تو اس نے اس مقصد کے لیئے ہاملکار کارتھیجی[2] سے جو صقلیہ میں اپنی فوجوں کو لے کر جنگ کر رہا تھا۔ سمجھوتا کر لیا۔ ایک دن اس نے سائراکیوز کے لوگوں اور مجلس اُمراء کو جمع کیا۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اُسے جمہوریت

---

[1] شاہ سائراکوز از ۳۱۷ ق۔م۔ موت ۲۸۹ ق۔م۔ میں واقع ہوئی۔

[2] ہاملکار بارکاد کے آباؤ اجداد میں سے تھا۔

نے معاملات پر ان سے گفتگو کرنی تھی۔ جب وہ سب جمع ہو گئے تو مقررہ اشارہ پر سپاہیوں نے تمام امراء کو اور عوام میں سے سب سے زیادہ دولت مند لوگوں کو قتل کر دیا۔ جب ان سب کا خاتمہ ہو گیا تو اس نے شہر کی حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اور بغیر جھگڑے فساد کے حکومت کرتا رہا۔ اور گو اسے دو دفعہ اہل کارتھیج نے شکست دی اور آخر میں وہ محاصرہ میں پھنس گیا۔ لیکن اس نے نہ صرف کامیابی کے ساتھ اس شہر کی مدافعت کی بلکہ اپنی فوج کے ایک حصے کو اس کی حفاظت کے لئے چھوڑ کر، دوسرے حصے سے افریقہ پر حملہ آور ہوا۔ اور تھوڑے ہی عرصہ میں سائراکیوز کا محاصرہ اٹھانے میں کامیاب ہوا۔ اہل کارتھیج ایسی مصیبت میں مبتلا ہوئے کہ انہیں مجبوراً اگاتھوکلیز سے معاملہ کرنا پڑا۔ صقلیہ کو انہوں نے اس کے حوالہ کیا۔ اور خود افریقہ کے قبضہ پر اکتفا کیا۔

پس جو کوئی اس شخص کے کاموں اور غیر معمولی ذہانت پر نظر ڈالے گا اسے شاید ہی کوئی چیز نظر آئے جو تقدیر کی طرف منسوب کی جا سکے۔ اس لئے کہ اس نے جو کچھ عظمت حاصل کی اس کے لئے وہ کسی اور کا

رہین منت نہیں تھا۔ بلکہ اس نے خود باقاعدہ طور پر فوجی پیشہ میں یہ عظمت حاصل کی۔ اس کے حصول میں ہزار دشواریاں پیش آئیں۔ اور اسی طرح حاصل ہونے کے بعد بھی اُسے طرح طرح کے خطرات کا سامنا کرنا پڑا۔ مگر ساتھی شہریوں کو قتل کرنا، دوستوں کو دھوکا دینا، اپنا اعتبار رکھو بیٹھنا، رحم نہ کرنا اور مذہب کو خیرباد کہنا کوئی تعریف کی بات نہیں۔ ان ذرائع سے سلطنت مل جائے تو مل جائے، ناموری حاصل نہیں ہوا کرتی۔ لیکن اگر اس ہمت پر غور کیا جائے جس سے آگاتھوکلیز نے خطروں کا مقابلہ کیا اور ان پر غالب آیا اور اس استقلال کو دیکھا جائے کہ اُس نے کس طرح مشکلات کو برداشت کیا۔ اور ان پر فتح پائی۔ تو پھر کوئی وجہ نہ ہوگی کہ اس کی بھی اتنی ہی عزت نہ کی جائے جتنی کہ کسی مشہور سے مشہور سپہ سالار کی۔ تاہم اس کا انتہائی ظلم اور بے رحمی اور اُس کے بے شمار جرائم اس بات کی اجازت نہیں دیتے کہ اُسے عظیم ترین شخصیتوں میں شمار کیا جائے۔ مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ ہم تقدیر یا استحقاق کی جانب وہ منسوب کریں جو اس نے بغیر ان دونوں کے حاصل کیا۔

ہمارے اپنے زمانے کی ایک مثال ہے: جب الگزانڈر ششم پوپ تھا تو فرمو کا باشندہ اولیور یتو۔

چند سال پیشتر یتیم ہو چکا تھا۔ اُس کی تربیت اُس کے ماموں ڑیو وانی فوڑ لیانی نے کی۔ اُسے بچپن ہی میں پا ولو ویتلی کے سپرد کر دیا گیا تاکہ اس مشہور سپہ سالار کے ماتحت اچھی طرح فن جنگ سیکھ لے۔ اور پھر فوج میں کوئی اعلیٰ عہدہ حاصل کر سکے۔ پاؤلو کے انتقال کے بعد[1] وہ اُس کے بھائی ویتلوزو کے ماتحت کام کرتا رہا۔ آدمی ذہین، بیباک اور ثابت قدم تھا۔ تھوڑی ہی مدت میں اس کا شمار اپنی فوج کے بہترین سپاہیوں میں ہونے لگا مگر چونکہ وہ دوسروں کی ماتحتی کو اپنی کسرِ شان سمجھتا تھا۔ لہٰذا اُس نے یہ ترکیب سوچی کہ ویتلیشی کی حمایت اور فرمو کے بعض ایسے شہریوں کو سازش میں شریک کر کے جو اپنے ملک کی آزادی پر غلامی کو ترجیح دیتے تھے، اس شہر پر قبضہ جمائے۔ چنانچہ اس نے ڑیو وانی فوڑ لیانی کے نام ایک خط بھیجا۔ جس میں یہ لکھا کہ وطن سے مدتوں دور رہنے کے بعد اس کی یہ خواہش ہے کہ وہ پھر ایک مرتبہ اُن سے ملے۔ اور اپنے وطن مالوف کی زیارت کرے۔ نیز اپنی

---

[1] پیسا کے خلاف اہل فلورنس نے جو جنگ کی۔ اس میں یہی ان کی افواج کا سالار تھا۔ مگر بعد میں اس پر بغاوت کا الزام لگایا گیا اور یکم اکتوبر ۱۴۹۹ء کو اسے موت کی سزا دی گئی۔

موروثی ملک کو ذرا دیکھے بھالے۔ اور چونکہ اب تک اس
کی بس ایک ہی کوشش رہی تھی، یعنی نام پیدا کرنا، اس
لیئے اُس کی خواہش ہے کہ وہ عزت کے ساتھ وطن میں
داخل ہو۔ اس طرح کہ اُس کے احباب اور پیرووُں میں سے
ایک سو اس کے ہمراہ آئیں۔ تاکہ ہم وطنوں کو یہ اندازہ ہو کہ
اُس نے اپنا وقت فضول نہیں گنوایا۔ اُس نے ژیووانی سے
یہ بھی التجا کی کہ وہ براہِ کرم ایسا انتظام کرلے کہ فرمو کے
شہری عزت و احتشام کے ساتھ اس کا استقبال کریں۔ کہ
اس استقبال سے نہ صرف اس کی بلکہ اس کے ماموں کی
بھی عزت افزائی ہوگی جس نے اُن کو پالا پوسا تھا۔
چنانچہ ژیووانی نے ہر طرح اپنے بھانجے کی خاطر
مدارات کی اور شہریوں نے بھی خوب آؤ بھگت کرائی۔ اور
اپنے ہی پاس ٹھیرایا۔ اولیوریتو نے کچھ روز تو اس کے
ساتھ قیام کیا۔ اور اسی زمانہ میں جب اپنے بد ارادہ کو
پورا کرنے کے انتظامات کر لیئے تو ایک نہایت ہی پر تکلف
دعوت کی[1] جس میں اپنے ماموں اور فرمو کے تمام اکابر کو
بلایا۔ جب کھانا ہو چکا اور جب موقع خاطر تواضع ختم ہوئی
تو اولیوریتو نے ایک چال چلی۔ پوپ الگزانڈر اور اس

---

[1] بڑے دن کا موقع تھا۔ ۲۶ر دسمبر ۱۵۰۱ء

سے بچے سیزار کی عظمت اور ان کی مہموں کا ذکر چھیڑ کے اس نے موضوع سخن بالکل بدل دیا۔ ژیو وانی اور بعض اور اشخاص اس کی بات کا جواب دے رہے تھے کہ وہ یکایک اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور کہنے لگا کہ یہ معاملات ایسے ہیں کہ ان پر گفتگو علیحدگی میں ہونی چاہیئے۔ اُس نے ایک دوسرے کمرے کا رخ کیا۔ ماموں اور دوسرے شہری اُس کے پیچھے ہو لئے۔ وہ سب کے سب اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھے ہی تھے کہ سپاہی جو چھپے ہوئے انتظار کر رہے تھے آن کودے اور ژیو وانی اور باقی سب کو تہِ تیغ کر ڈالا۔

اس قتل و خون کے بعد اولیورتیو نے گھوڑے کی پیٹھ پر سوار ہو کر پورے شہر کا چکر کیا۔ اور صدر مجسٹریٹ کو محل میں بند کر دیا۔ مجبوراً لوگوں نے ڈر کے مارے اس کی اطاعت قبول کی۔ اور اس حکومت کو تسلیم کیا جس کا وہ خود سردار بنا۔ جو جو ناراضگی کی بناء پر اُس کے راستے میں حائل ہو سکتے تھے۔ اُنھیں اُس نے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ نئے نئے ملکی اور فوجی فرمانوں کے ذریعے اپنی حکومت کو مستحکم کیا۔ اس طرح کہ اس کی حکومت کے زمانے میں جو ایک سال تک قایم رہی وہ خود فرمو میں نہ صرف محفوظ رہا۔ بلکہ اپنے تمام ہمسایوں کے دل میں اُس کا خوف طاری ہو گیا۔ اسے اپنی جگہ سے ہٹانا

اتنا ہی مشکل ہوتا جتنا اگا تھوکلینز کو اگر جیسا کہ پہلے کہا جاچکا ہے
اس موقع پر جب سیزارے پورڑیا نے سینی گا لیا میں اریینی
اور ویتیلی کو گرفتار کیا ہے وہ سیزارے بورڑیا کی چال میں نہ
آجاتا۔ یہاں وہ بھی پھنس گیا۔ ماموں کو قتل کئے سال بھر ہوا
تھا کہ وہ تیلوزو کے ساتھ جو بہادری کے کاموں اور
برے کاموں میں اس کا پیشوا تھا۔ پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔
سوال کیا جا سکتا ہے کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ اگا تھوکلینز
اور بعض اسی قسم کے لوگ باوجود ہزار دھوکے فریب
اور مظالم کے مدتوں چین سے اپنے ملکوں پر حکومت کرتے
رہے اور بیرونی دشمنوں سے بھی اپنی مدافعت کرتے رہے
اور کسی نے چوں نہ کیا۔ برخلاف اس کے بعض دوسرے
افراد اپنے ظلم کی وجہ سے اپنی حیثیت امن و امان کے
زمانے میں بھی قایم نہ رکھ سکے۔ چہ جائیکہ جنگ کے خطرناک
زمانے میں۔ اس کا سبب میرے خیال میں یہ ہے کہ ظلم کا
بھی محل ہوتا ہے۔ اگر بری باتوں کی تعریف ممکن ہو تو میں
کہوں گا کہ ظلم اس صورت میں برمحل ہے جب بس ایک
دفعہ اپنی حفاظت کی خاطر روا رکھا جائے۔ اور بعد میں اس
سے اجتناب کیا جائے۔ اور جہاں تک ممکن ہو محکوم کے
حق میں اس رویہ کو بدلا جائے۔ برخلاف اس کے بے جا

زیادتیاں وہ ہیں جو شروع میں چھوٹے پیمانے پر ہوں
مگر وقت کے ساتھ اُن میں کمی کی جگہ اضافہ ہوتا جائے۔
جو پہلے طریقہ پر کاربند ہوتے ہیں اُن پر اگر خدا کی مہربانی
اور بندوں کی نوازش ہو تو اگاتھوکلیز کی طرح انھیں
مایوسی کی کوئی وجہ نہیں۔ مگر جو دوسرے طریقہ پر کاربند
ہوں اُن کا خدا ہی حافظ ہے۔

پس ہم اِس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ جب کوئی غاصب کسی
ریاست پر قبضہ کرلے تو اسے یہ طے کرنا چاہیئے کہ کون
کون سے مظالم ضروری ہیں۔ اُسے چاہیئے کہ جو ظلم کرنا ہو
بس ایک دفع کر ڈالے۔ تاکہ بار بار اس کی ضرورت
پیش نہ آئے۔ روز روز ظلم نہ ہوگا تو لوگوں میں بھروسہ پیدا
ہوگا۔ اور اگر انھیں نفع پہونچے گا تو وہ دوست
بن جائیں گے۔ جو کوئی اس اصول پر عمل نہیں کرے گا، یہ
چاہے اپنی کم ہمتی کے سبب سے ہو اور چاہے دوسروں
کے کہنے سننے کی بناء پر، اُس کے ہاتھ ہمیشہ خون آلود رہیں گے۔
نہ وہ اپنی رعایا پر اعتبار کر سکے گا۔ اور نہ رعایا کو اس سے
لگاؤ پیدا ہوگا۔ یہ سب مسلسل اور پے بہ پے مظالم کی وجہ
سے۔ نقصان پہونچانا ہو تو چاہیئے کہ ایک دفع پہونچا دے۔
بدمزگی دیر تک نہ رہے گی تو غصہ بھی زیادہ نہ ہوگا

اور عنائتیں کرنا ہوں تو تھوڑی تھوڑی۔ تاکہ ان کا ذائقہ دیر تک قایم رہے۔

اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ بادشاہ کے تعلقات رعایا کے ساتھ ایسے ہوں کہ چاہے جیسے بھی اِنقلابات ہوں اچھے یا بُرے اُس کے رویئے میں ذرا بھی تبدیلی نہ ہونے پائے۔ اس لئے کہ اگر بادشاہ پر بُرا وقت آن پڑنے سے تبدیلی کی ضرورت محسوس ہوگی تب سختی کرنے کا وقت نہیں رہے گا رہی نرمی سو وہ ٹھکرا دی جائے گی۔ اس وجہ سے کہ اِسے مجبوری پر محمول کیا جائے گا۔ اور لوگ بادشاہ کا ذرا احسان نہ مانیں گے۔

# باب ۹

## قومی بادشاہت

اب میں ایک اور طرح کی شخصیت سے بحث کروں گا۔ یعنی اُس سربرآوردہ شہری سے جو جرم و تشدد کی مدد سے نہیں بلکہ اپنے ساتھی شہریوں کی مہربانی سے اپنے ملک کی بادشاہت حاصل کرے۔ اسے قومی بادشاہت کہا جاسکتا ہے۔ اور اس کا حصول نہ تو محض غیرمعمولی لیاقت پر مبنی ہوتا ہے اور نہ خوش نصیبی پر۔ یہ مبنی ہوتا ہے دانشمندی اور بختاوری دونوں کے مجموعے پر۔ پھر یہ ہے کہ یہ بادشاہت ملتی ہے یا تو قوم کی عنایت سے یا شرفاء کی مہربانی سے۔ اس لئے کہ ہر شہر میں دونوں مخالف جماعتیں موجود ہوتی ہیں۔ سبب یہ ہے کہ قوم کی خواہش ہوتی ہے کہ شرفاء اس پر حکومت اور زیادتی نہ کریں اور شرفاء یہ چاہتے ہیں کہ قوم پر حکومت کریں۔ اور اُسے ستاتے

رہیں۔ یہ دونوں خواہشیں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اسی لئے نتیجہ کے طور پر ان تین صورتوں میں سے ایک ظہور میں آتی ہے بادشاہت یا جمہوریت یا تراج۔

بادشاہت کو ظہور میں لاتی ہے یا تو قوم یا جماعت شرفاء۔ یہ اس پر موقوف ہے کہ ان میں سے کسے موقع ہاتھ آیا۔ ہوتا یہ ہے کہ جب شرفاء یہ دیکھتے ہیں کہ قوم کا مقابلہ ممکن نہیں تو پھر وہ اپنے میں سے ایک کو آگے کرتے ہیں۔ اور پھر اسی کو بادشاہت سونپ دیتے ہیں تاکہ اُس کی بدولت انھیں اپنی خواہشیں پوری کرنے کا موقع ملے۔ اسی طرح جب قوم اپنے آپ کو شرفاء کے مقابلے میں بے بس محسوس کرتی ہے۔ تو وہ بھی اپنے آپ میں سے ایک کو اچھالتی ہے۔ اور اسے بادشاہ بنا دیتی ہے۔ تاکہ اس کے اختیارات سے قوم کی مدافعت ہو۔

جو کوئی اپنی بادشاہت کے لئے شرفاء کا رہین منت ہوتا ہے۔ اُسے اس شخص کے مقابلے میں جسے قوم نے بادشاہ بنایا ہو۔ اپنی بادشاہت برقرار رکھنا زیادہ دشوار ہوتا ہے۔ اس لئے کہ وہ یہ دیکھتا ہے کہ اسی کی جماعت میں بہت سے ایسے افراد ہیں جو اس کی ہمسری کرتے ہیں۔ ان پر وہ نہ تو حسب منشاء حکومت کر سکتا ہے۔ اور

نہ ان کو قابو میں رکھ سکتا ہے۔ لیکن جو قوم کی امداد سے اِس رتبہ تک پہونچے اس کا مدمقابل کوئی نہیں ہوتا۔ اور اس کے اِرد گرد ایسے اشخاص یا تو سرے سے ہوتے ہی نہیں یا بہت ہی کم ہوتے ہیں جنھیں اس کی اطاعت سے گریز ہو۔

ایک بات اور بھی ہے۔ انصاف پسندی کے ساتھ اور دوسروں کو نقصان پہونچائے بغیر شرفاء کو مطمئن نہیں کیا جا سکتا۔ مگر قوم کو مطمئن کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے کہ قوم کا مقصد شرفاء کے مقصد سے نیک تر ہوتا ہے۔ شرفاء ظلم کرنا چاہتے ہیں۔ اور قوم اپنے آپ کو ظلم سے صرف بچانا چاہتی ہے۔ یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ قوم اگر ناراض ہو تو تخت و تاج کا برقرار رکھنا ناممکن ہے۔ اس لئے کہ قوم کی تعداد اتنی بڑی ہوتی ہے۔ ہاں شرفاء سے مقابلہ ہو تو مدافعت ممکن ہے۔ اس لئے کہ اُن کی جماعت گنتی کے چند افراد پر مشتمل ہوتی ہے۔ بادشاہ کے ساتھ ناراض قوم کا بدترین سلوک بس یہ ہو سکتا ہے کہ وہ بادشاہ کا ساتھ چھوڑ دے۔ مگر شرفاء ناراض ہوں گے تو نہ صرف ساتھ چھوڑ دیں گے بلکہ علم بغاوت بلند کریں گے۔ بات یہ ہے کہ وہ ان معاملات میں زیادہ دوراندیش بھی ہوتے ہیں۔ اور زیادہ ہوشیار بھی۔ اسلئے وہ ٹھیک

ٹھیک وقت پر ایسی ترکیبیں کر لیتے ہیں جن سے وہ خود محفوظ بھی ہو جاتے ہیں اور آنے والے حاکم کے فیوض سے مالا مال بھی۔ پھر یہ ہے کہ بادشاہ کا قوم کے ساتھ عمر بھر کا سابقہ ہوتا ہے۔ اور شرفاء کے ساتھ تعلقات عارضی ہوتے ہیں۔ ان کا بنانا اور بگاڑنا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ جب چاہا اختیارات عطا کر دیئے اور جب چاہا چھین لئے۔

اس مسئلے کو میں ذرا اور واضح کرنا چاہتا ہوں۔ شرفاء شرفاء میں فرق ہے۔ دو راستوں میں سے وہ ایک راستہ اختیار کرتے ہیں۔ یا تو ان کا مفاد بادشاہ کے مفاد کے ساتھ وابستہ ہو جاتا ہے۔ یا ایسا نہیں ہوتا۔ جن کا مفاد اپنے مفاد کے ساتھ وابستہ ہو اور جو حرص و ہوس کے بندے نہ ہوں ان کی عزت کرنی چاہیئے۔ اور ان کے ساتھ محبت کا برتاؤ کرنا چاہیئے۔ جن کا مفاد اپنے مفاد کے ساتھ وابستہ نہ ہو اُن کے ساتھ دو رویوں میں سے ایک رویہ اختیار کیا جا سکتا ہے۔ اگر ان کے طرزِ عمل کی وجہ ان کی کم ہمتی یا طبیعت کا بودا پن ہے، تو ان سے اپنا کام نکالنا چاہیئے۔ خاص طور پر اُن سے جو عاقل و دانا ہوں۔ کامیابی کے دور میں اُن کی وجہ سے عزت کو اور چار چاند لگیں گے۔ اور مصیبت کے زمانے میں اُن سے کسی قسم کا خوف نہ ہوگا۔ لیکن اگر وہ

جاہ طلبی کی وجہ سے یہ رویہ اختیار کریں تو یہ اس بات کی نشانی ہے کہ انھیں بادشاہ سے زیادہ اپنا خیال ہے۔ ایسوں سے بادشاہ کو چوکنا رہنا چاہیئے۔ ان سے اُسی طرح ڈرنا چاہیئے جیسے کھلے دشمنوں سے۔ اس لئے کہ جب اُس پر بپتا پڑے گی تو وہ نقصان پہونچانے میں دریغ نہ کریں گے۔

جو شخص قوم کی مدد سے بادشاہت حاصل کرے اُسے چاہیئے کہ قوم کے ساتھ اچھے تعلقات رکھے۔ یہ کچھ مشکل بھی نہیں۔ لوگ تو بس اتنا چاہتے ہیں کہ اُن پر ظلم اور زیادتی نہ ہو۔ مگر جو کوئی قوم کی مرضی کے خلاف اور شرفا کی مہربانی سے بادشاہ بنا ہو اُس کے لیئے ضروری ہے کہ قوم کو منائے۔ اس میں اُسے فوری کامیابی ہوگی۔ بشرطیکہ وہ قوم کو اپنے سایۂ عاطفت میں لے لے۔ اس لئے کہ لوگ جب کسی سے بدی کی توقع رکھیں اور وہ ان کے ساتھ نیکی کا برتاؤ کرے، تو اُنھیں ایسے محسن سے قریبی تعلق پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ جلد ہی بادشاہ کے بہی خواہ بن جاتے ہیں۔ بمقابلہ اس کے جس کو اُن کی بدولت بادشاہت نصیب ہوئی ہو۔ لوگوں کو رام کرنے کے ہزار طریقے ہیں۔ یہ طریقے حالات کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ اس لئے اس کے متعین قاعدے نہیں بیان کیئے جا سکتے۔ چنانچہ میں

انہیں نظر انداز کرتا ہوں۔ مگر ایک بات میں پھر کہوں گا۔ بادشاہ کے لیئے ضروری ہے کہ قوم کو اپنا دوست بنالے۔ ورنہ مصیبت کے وقت ایک بنائے نہ بنے گی۔

اسپارٹا کے بادشاہ نابس[۱] پر پورے یونان نے دھاوا بولا اور ظفر مند رومن افواج نے حملہ کیا۔ ان کے مقابلے میں اس نے اپنے ملک کی مدافعت اور اپنے تاج کی حفاظت کی۔ جب یہ خطرہ سامنے آیا تو رعایا میں ایسے افراد کی تعداد بہت ہی مختصر تھی جن سے اُسے اپنے آپ کو محفوظ رکھنا ضروری تھا۔ عام طور پر لوگ مخالف ہوتے تو کام نہ چلتا۔

میرے قول کو کوئی اس پرانی کہاوت کا حوالہ دے کر رد کرنے کی ناکام کوشش نہ کرے کہ "قوم پر اعتماد کرنا ایسا ہی ہے جیسے دَلدَل پر عمارت کھڑی کرنا" اس لیئے کہ ممکن ہے یہ قول ایسے شہری کے حق میں ٹھیک ہو جس کا حکومت سے کوئی تعلق نہ ہو۔ جس کا دارومدار قوم کی نوازش پر ہو اور جو یہ اُمید رکھتا ہو کہ جب دشمن یا حکام اُسے دبائیں گے تو لوگ اُسے آکر بچالیں گے ایسی صورت میں انسان اکثر دھوکا بھی کھاتا ہے جیسا گراچی

---

[۱] اسپارٹا کا جابر بادشاہ ۔ ۲۰۷ تا ۱۹۲ ق ۔ م ۔

کے ساتھ روما میں پیش آیا۔ اور میسرڑیورڑیو اسکالی کے ساتھ فلورنس میں[1]۔ مگر جب قوم سے توقعات باندھنے والا کوئی بادشاہ ہو جس میں حکم دینے کی صلاحیت ہو، جو آلام و مصائب کے آتے ہی جی نہ چھوڑ بیٹھتا ہو۔ اور جو اگر ایک طرف اپنی جرأت اور طرزِ عمل سے ساری جماعت میں جان ڈالتا ہو۔ تو دوسری طرف ہر طرح کی قابل عمل تدبیریں بھی اختیار کرتا ہو۔ ایسے شخص کو لوگ دغا نہیں دیتے اور یہ ثابت کر دیتے ہیں کہ اس نے جو توقعات باندھ رکھی تھیں وہ بے جا نہ تھیں۔

اس قسم کی بادشاہتوں کے لئے خطرہ کا موقع اس وقت ہوتا ہے جب سول حکومت مطلق حکومت میں بدلتی ہے اس لئے کہ اس قسم کے بادشاہ حکومت یا تو خود کرتے ہیں یا حکام کے ذریعہ۔ دوسری صورت میں اُن کی حکومت مقابلتاً کمزور اور غیر مستحکم ہوتی ہے اس لئے کہ اس کا دارومدار کلی طور پر ان شہریوں پر ہوتا ہے۔ جو حکام بنائے جاتے ہیں۔ اور جو بے چینی کے زمانے میں خاص طور پر حکومت کا نہایت آسانی سے خاتمہ کر سکتے ہیں، سازش سے یا کھلم کھلا سرکشی کر کے۔ اور ان ہنگاموں میں بادشاہ کو اتنا موقع نہیں ملتا

---

[1] ۱۱ر جنوری ۱۳۴۳ء کو اُسے موت کی سزا دی گئی۔

کہ اپنے مطلق اختیارات کو کام میں لائے۔ شہری اور رعایا تو عادی ہوتے ہیں حکام سے احکام پانے کے، بھلا اس شور و شغب میں بادشاہ کی کون سنتا ہے۔ غرض ایسے مشکل زمانے میں ان لوگوں کی تعداد بہت ہی مختصر ہوتی ہے جن پر بادشاہ بھروسہ کر سکے۔ امن و امان کے زمانے میں جب شہریوں کو ریاست کی ضرورت ہوتی ہے بادشاہ جو کچھ مشاہدہ کرے وہ قابل اعتبار نہیں۔ اس لئے کہ ہر شخص اُس کی ہاں میں ہاں ملاتا ہے۔ لوگ لمبے چوڑے وعدے کر لیتے ہیں۔ جب جان دینے کا موقع نہیں ہوتا تو ہر شخص یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ بادشاہ کی خاطر جان ہتھیلی پر لئے پھرتا ہے۔ مگر جب اس کا وقت آتا ہے اور ریاست شہریوں کی محتاج ہوتی ہے۔ تب کوئی سامنے نہیں آتا۔ یہ تجربہ خاص طور پر اس وجہ سے بھی خطرناک ہے کہ یہ ایک ہی دفعہ کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے دانشمند بادشاہ کو ایسا راستہ اختیار کرنا چاہیئے کہ رعایا ہر طرح کے حالات میں ریاست اور بادشاہ کو اپنے لئے ضروری سمجھے۔ کہ ایسی صورت میں اُس کی وفاداری پائیدار ہوگی۔

# باب ۱۰

## مختلف بادشاہتوں کی طاقت کا صحیح اندازہ کرنے کا طریقہ

ان بادشاہتوں کی خصوصیات کی تحقیقات کے سلسلے میں ایک اور بات قابل غور ہے وہ یہ کہ بادشاہ کے پاس اتنی طاقت ہے کہ بوقت ضرورت وہ محض اپنے ذاتی وسائل کو کام میں لاکر اپنا کام نکال لے۔ یا وہ ہمیشہ دوسروں کی مدد کا محتاج ہے۔ مجھ کو اسے اور اچھی طرح واضح کرنے دیجئے۔ میرے خیال میں وہ بادشاہ اپنی مدد آپ کر سکتے ہیں جن کے پاس بے شمار آدمی اور بے انتہا دولت ہو جس کی مدد سے وہ اتنی بڑی فوج تیار کر سکیں جو ہر حملہ کرنے والے سے مقابلہ کرنے کے قابل ہو۔ اور وہ بادشاہ میری نظر میں ہمیشہ دوسروں کی مدد کے محتاج ہیں جو مرد میدان نہیں۔ بلکہ جنگ کے موقع پر فصیلوں کے پیچھے اپنی حفاظت کی فکر کرتے ہیں سب پہلی قسم پر بحث کی

جا چکی ہے۔ اگر ضرورت ہوئی تو پھر اس کا تذکرہ کروں گا۔
دوسری قسم کے بارے میں کام کی بات بس اتنی ہے کہ
ایسے بادشاہوں کو اس پر آمادہ کیا جائے کہ اپنے شہروں
میں ہر طرح کا سامان فراہم کریں اور ان کی مدافعت کا
انتظام کریں۔ رہا ملک کا بقیہ حصّہ سو اس کو خدا پر چھوڑیں۔
جو بادشاہ اپنے شہر کی اچھی طرح قلعہ بندی کرے گا اور
رعایا کے لیئے تمام وہ انتظامات کرے گا جو میں نے اوپر
بیان کیئے ہیں۔ اور جن کا میں بعد میں بھی اکثر ذکر کروں گا،
تو دوسرے بادشاہ اس پر حملہ کرنے میں خاص احتیاط برتیں
گے۔ اس لیئے کہ انسان ایسی مہم کی ذمّہ داری مشکل سے
اپنے اوپر لیتا ہے جس میں دقّتیں صاف نظر آرہی ہوں۔ یہ
کھلی ہوئی بات ہے کہ اگر کوئی بادشاہ اچھی طرح شہر کی
قلعہ بندی کرے اور رعایا کو اس سے نفرت نہ ہو تو اس
پر حملہ کرنا سہل کام نہیں۔

جرمنی کے شہر بالکل آزاد ہیں۔ آس پاس کا بہت
تھوڑا سا علاقہ ان کے ماتحت ہے۔ اور جب انھیں اس
میں فائدہ معلوم ہوتا ہے۔ تو وہ شہنشاہ کی اطاعت کرتے
ہیں۔ مگر انھیں نہ تو شہنشاہ کا خوف ہے اور نہ کسی اور
قریبی ریاست کا۔ وجہ یہ ہے کہ اُن کی اتنی اچھی طرح

قلعہ بندی ہوئی ہے کہ ہر شخص یہی خیال کرتا ہے کہ اُن پر حملہ بہت تھکا دینے والا اور کٹھن ہوگا۔ اُسے نظر آتا ہے کہ ان شہروں کے چاروں طرف مناسب خندقیں اور فصیلیں ہیں۔ ان کے پاس معقول توپ خانے ہیں۔ اور ان کے سرکاری گوداموں میں ہمیشہ ایک سال کے لئے کھانے، پینے کا سامان اور ایندھن جمع رہتا ہے۔ اور اس کے علاوہ لوگوں کو چپ چاپ رکھنے کی خاطر اور اس لئے کہ ان کی طرف سے ریاست کو کوئی نقصان نہ پہنچ جائے۔ وہ ہمیشہ سال بھر کے لئے ایسی اشیائے خام جمع کر لیتے ہیں۔ جن سے اُن کے لئے کام مہیا کیا جا سکے ایسے کام جن میں اُن شہروں کی زندگی اور قوت پنہاں ہے اور جن پر عوام کا دارو مدار ہے۔ علاوہ بریں وہ فوجی قواعد بھی کرتے رہتے ہیں۔ اور اسے جاری رکھنے کے لئے بہت سے قوانین بنائے ہیں۔

پس جب بادشاہ کے پاس ایک مستحکم شہر ہو اور لوگ اس سے نفرت نہ کرتے ہوں اُس پر حملہ نہیں کیا جا سکتا۔ اور اگر حملہ ہو بھی تو حملہ کرنے والے کا سر نیچا ہوگا۔ حالات روز بدلتے رہتے ہیں اور پورے ایک سال تک فوج کو بغیر کسی رکاوٹ کے میدان جنگ میں

ڈالے رکھنا تقریباً ناممکن ہے۔ شاید کوئی یہ کہے کہ جب لوگ دیکھیں گے کہ ان کی جائداد جو شہر کی فصیل سے باہر ہے نذر آتش ہو رہی ہے تو اُن سے کیسے چپ چاپ بیٹھا جائے گا۔ محاصرہ کی طوالت اور ذاتی مفاد کی وجہ سے وہ بادشاہ کو بھول جائیں گے۔ جواب یہ ہے کہ ایک طاقتور اور باہمت بادشاہ اِن سب دقتوں کو سر کر سکے گا۔ کبھی اپنی رعایا کو یہ اُمید دلاکر کہ بس اب مصیبتوں کا خاتمہ ہونے والا ہے۔ اور کبھی انہیں دشمن کی سفاکی کا خوف دلاکر۔ اور اپنے آپ کو ایسے لوگوں سے بچاکر جو اُس کی نظر میں خاص طور پر بے باک ہوں گے۔

ایک اور بات ہے۔ آنے کے بعد فوراً جبکہ لوگوں کے دلوں میں گرمی باقی ہوگی اور وہ ملک کو بچانے کے لئے تیار رہوں گے دشمن ملک میں ہر طرف آگ لگا دے گا اور اس کو تباہ و برباد کر دے گا۔ اس وقت پس و پیش کرنے کے کیا معنی۔ جب کچھ عرصہ بعد مزاج میں ٹھنڈک پیدا ہو جائے گی۔ جو نقصان ہونا تھا سو ہو چکا ہوگا۔ اور جو آفتیں آنی تھیں وہ آچکی ہوں گی۔ اور اب ان کی کوئی تلافی ممکن نہ ہوگی۔ ان حالات میں لوگ اس پر ضرور آمادہ ہو جائیں گے کہ اپنے بادشاہ کے ساتھ ایکا کرلیں

اس لیے کہ وہ بظاہر ان کا احسان مند نظر آئے گا۔ یوں کہ اس کی مدافعت میں ان کے گھر بار جل کر خاک ہو گئے اور ان کے مقبوضات تباہ و برباد۔ اپنی کی ہوئی اور اپنے ساتھ کی ہوئی نیکی دونوں کے بندھن میں انسان جکڑا ہوا ہے کہ یہی فطرت کا تقاضا ہے۔ پس اگر ہر بات کا اچھی طرح خیال رکھا گیا تو بادشاہ کے لئے یہ کچھ مشکل نہ ہو گا کہ اپنی رعایا کے حوصلے بڑھائے رکھے۔ شرط اتنی ہے کہ سامانِ رسد کی کمی نہ پڑنے پائے اور مدافعت اچھی طرح ہو۔

# باب ۱۱

## مذہبی بادشاہتیں

اب بس مذہبی بادشاہتوں کا ذکر باقی ہے۔ یہاں جتنی بھی دقتیں ہیں وہ سب حصول سے پہلے پیش آتی ہیں۔ مذہبی بادشاہت ملتی تو ہے لیاقت سے یا خوبیٔ قسمت سے۔ مگر اسے برقرار رکھنے کے لئے دونوں میں سے ایک بھی ضروری نہیں۔ وہ اپنی جگہ پر کھڑی رہتی ہے ان پرانے مذہبی احکام کی وجہ سے جو نہایت ہی کارگر ہیں۔ اور بادشاہ کچھ بھی کریں اور کیسی ہی زندگی گزاریں ان کو اپنی جگہ سے کوئی نہیں ہٹا سکتا۔ بادشاہوں میں یہی بادشاہ ایسے ہیں جنہیں اپنی بادشاہت کی مدافعت کی ضرورت نہیں۔ ان کی رعایا ہوتی ہے مگر وہ ان پر حکومت نہیں کرتے۔ ان ریاستوں کی کوئی خاص حفاظت نہیں کی جاتی مگر پھر بھی وہ ان سے نہیں چھنتیں۔ اور گو رعایا پر حکومت نہیں ہوتی مگر رعایا کو اس کی کیا پرواہ۔

اور نہ رعایا کے دل میں بادشاہ سے علیحدگی اختیار کرنے کی کوئی خواہش ہوتی ہے۔ محفوظ اور خوش حال زندگی کچھ انہیں ریاستوں کا حصہ ہے۔ مگر وہ اسی قوت کی مدد سے قایم و برقرار رہتی ہیں جن تک انسانی دماغ کی رسائی نہیں۔ میں ان کے متعلق کیا کہہ سکتا ہوں۔ ان کی عزت خدا کی طرف سے ہے۔ اور ان کا قایم رکھنے والا بھی خدا ہی ہے۔ ایسی ریاستوں سے بحث کوئی نہایت گستاخ اور ناعاقبت اندیش شخص ہی کر سکتا ہے۔

تاہم اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ آخر کلیسا کو دنیاوی امور میں اتنی عظمت کیسے حاصل ہوئی۔ خاص طور پر جب یہ معلوم ہو کہ الگزانڈر سے پہلے تمام اطالوی بادشاہ نہ صرف وہ جو بادشاہ کہلائے بلکہ تمام نواب اور جاگیردار، خواہ کتنے ہی ادنیٰ درجہ کے کیوں نہ ہوں) کلیسا کی دنیاوی طاقت کو بہت ہی حقیر سمجھتے رہے ہیں۔ مگر ایک آج کا دن ہے[۱] کہ شاہ فرانس اس سے کانپتا ہے۔ اسی نے شاہ فرانس کو اطالیہ سے نکلوا دیا۔[۲] اور اہل وینس کو برباد کیا۔[۳] بات

---

[۱] پوپ جولیس دوم کا زمانہ۔
[۲] بذریعہ "مقدس لیگ" سنہ ۱۵۱۲ء
[۳] "کمبرائی لیگ" کے ذریعہ۔ سنہ ۱۵۰۸ء

اظہر من الشمس سہی مگر اسے یاد دلانا غالباً بے سود نہیں۔
شاہ فرانس، چارلس کے اطالیہ میں قدم دھرنے سے پہلے یہ ملک پاپائے روما، شاہ نیپلس، اہل وینس، ڈیوک آف مائلان اور اہل فلورنس کے زیر حکومت تھا۔ ان فرماں رواؤں کو دو فکریں لاحق تھیں۔ ایک یہ کہ کوئی بدیسی ہتھیاروں سے مسلح اطالیہ میں داخل نہ ہونے پائے۔ اور دوسرے آپس میں سے کوئی بھی کسی نئے علاقہ کو اپنے زیر حکومت نہ لائے۔ خاص طور پر پاپائے روما اور اہل وینس کی طرف سے زیادہ تشویش تھی۔ اہل وینس کی روک تھام کرنے کے لئے باقی سب کا اتحاد[1] اسی طرح ضروری تھا جس طرح فرارا کی مدافعت کے لئے اور پوپ کو دبائے رکھنے کے لئے انہوں نے روما کے جاگیرداروں سے کام لیا۔ یہ جاگیردار دو فرقوں میں منقسم تھے۔ آرسینی اور کالونینی۔ اس لئے جھگڑے کا ہمیشہ کوئی نہ کوئی بہانہ موجود رہتا تھا۔ وہ پوپ کی آنکھوں کے سامنے اپنے لئے اسلحہ مہیا کرتے تھے، یہی وجہ تھی پوپ کی کمزوری اور عدم تحفظ کی۔

---

[1] سنہ ۱۴۵۴ء میں یہ اتحاد قایم ہوا۔ ارکان تھے۔ پاپائے روما، نیپلس اور مائلان۔

کبھی کبھی ایسا بھی ہوا کہ اس عہدہ پر کوئی باہمت پوپ فائز ہوا۔ مثلاً سکسٹس[۱] مگر باوجود اپنی دانائی اور خوش قسمتی کے وہ بھی ان الجھنوں سے آزاد نہ ہو سکا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ پاپاؤں کی سرکاری زندگی مختصر ہوتی تھی۔ اوسط کوئی دس سال ہوتا ہوگا۔ اور اس عرصہ میں کسی ایک فرقہ کو بھی مشکل سے نیست و نابود کیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ مثال کے طور پر اگر ایک پوپ فرقہ کالوینی کو قریب قریب ختم کر بھی دے تو اس کے بعد دوسرا پوپ آئے گا۔ جس کی دشمنی آرسینی سے ہوگی۔ آرسینی سے نجات حاصل کرنا تو اس کے بس کی بات ہوگی نہیں۔ البتہ کالوینی کی تباہی ناتمام رہ جائے گی۔ اور وہ دوبارہ زندہ ہو جائیں گے۔ اسی سبب سے اطالیہ والوں کی نظر میں پاپاؤں کی دنیاوی طاقت کی ذرا بھی قدر نہیں تھی۔ بعد میں الکزانڈر ششتم[۲] برسر اقتدار آیا۔ اس وقت تک جتنے پوپ گزرے تھے ان میں بس یہی ایک شخص تھا جس نے دنیا کو دکھا دیا کہ دولت اور اسلحہ کی مدد سے پوپ کس طرح اپنا سکہ جما سکتا ہے۔ ایک تو ڈیوک والنٹینو کے ذریعہ، دوسرے فرانسیسیوں کے آنے سے فائدہ اٹھا کر اس نے وہ تمام کامیابیاں حاصل کیں۔

---

[۱] سکسٹس چہارم۔ ۱۴۷۱ تا ۱۴۸۴ء۔ [۲] ۱۴۹۲ء

جن کا بیان میں ڈیوک کے کارناموں کے سلسلے میں کرچکا ہوں اور گو اُس کا مقصد کلیسا کو نہیں بلکہ ڈیوک کے مرتبے کو بڑھانا تھا۔ مگر اس نے جو کچھ کیا اس سے کلیسا کی عظمت بڑھی۔ اور اُس کی موت اور ڈیوک کی تباہی[1] کے بعد کلیسا ہی نے اس کی ان تمام کوششوں سے فائدہ اٹھایا۔

پھر پوپ جولیس کی باری آئی۔ اب کلیسا طاقتور تھا۔ اس کے پاس روما نا کا پورا علاقہ تھا۔ روما کے جاگیرداروں کی طاقت ختم ہو چکی تھی۔ اور الکزانڈر کی مارپیٹ کی بدولت فرقہ بندیاں ٹوٹ کر برابر ہو چکی تھیں۔ اس کے لئے روپیہ جمع کرنے کی بھی ایسی راہیں کھلی ہوئی تھیں جن پر الکزانڈر سے پہلے کبھی کوئی پوپ گامزن نہیں ہوا تھا۔ ان باتوں میں جولیس نے نہ صرف الکزانڈر کی پیروی کی بلکہ اس سے ایک قدم آگے بڑھ گیا۔ اس کا ارادہ تھا کہ بلونا کو فتح کرے اہل وینس کو تباہ کرے۔ اور فرانسیسیوں کو اطالیہ سے نکال باہر کرے۔ ان تمام مہموں میں اسے کامیابی ہوئی۔ اور یہ خاص طور پر قابل تعریف اس

---

[1] جولیس دوم نے سیزار بورژیا کو اس وقت تک قید میں رکھا جب تک پورے روما نا سے اس کا عمل دخل نہ اُٹھ گیا (۱۵۰۴ء) پھر اس نے ہسپانیہ کی راہ لی اور ۱۵۰۷ء میں فیانا کے محاصرہ میں کام آیا۔

وجہ سے ہے کہ اس نے کسی ایک شخص کو نہیں بلکہ کلیسا کے ادارے کو زیادہ طاقتور بنانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ اس نے کالونینی اور آرسینی فرقوں کو بھی جن حدود کے اندر پایا تھا۔ اُن سے آگے نہیں بڑھنے دیا۔ یہ صحیح ہے انھیں شورش کرنے کا خیال پیدا ہوا، مگر اُس نے دو چیزوں کا انتظام بہت اچھی طرح کیا۔ ایک کلیسا کی عظمت، جس سے اُس نے اُن کے دلوں میں دہشت پیدا کی۔ اور دوسرے اُس نے اُنہیں کبھی اپنے کاردی نال نہیں بننے دیئے۔ جو بدامنی کا اصل سبب تھے۔ اگر ان فرقوں کے اپنے کاردی نال ہوں تو ان کا عرصہ تک خاموش رہنا ناممکن ہے۔ اس لئے کہ کاردی نال روما کے اندر اور روما کے باہر جتھے بناتے ہیں اور جاگیردار اُن کی تائید پر مجبور ہوتے ہیں۔ اور اس طرح رؤسائے کلیسا کی جاہ طلبی سے جاگیرداروں میں فسادات اور ہنگامے پیدا ہوتے ہیں۔ ان اسباب کی بنا پر اب کہ تقدس مآب لیو[۱] منصب پاپائی پر سرفراز ہوئے ہیں کلیسا کی طاقت بہت بڑھ چکی ہے۔ اور ان سے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ جس طرح ان کے پیش رؤں نے اپنے زور بازو سے اس کی شان میں اضافہ کیا، اسی طرح تقدس مآب اپنی نیکی اور بے شمار اوصاف سے اسے اور بھی عظمت اور وقار بخشیں گے

---

[۱] لیو دہم۔ میڈیچی خاندان سے تھا۔ لورنزو دمگنیفیکو کا بیٹا اور اس لورنزو کا چچا جس کے نام "بادشاہ" معنون ہے۔ پوپ از ۱۵۱۳ء تا ۱۵۲۱ء

# باب ۱۲

## سپاہ کی اقسام اور زر آشنا سپاہ کا بیان

میں اب ایک ایک کر کے ان سب بادشاہتوں کی مختلف اقسام کا ذکر کر چکا ہوں جن کے بارے میں میں اپنے خیالات کا اظہار کرنا چاہتا تھا۔ میں نے ایک حد تک ان کی قوت اور کمزوری کے اسباب سے بھی بحث کی ہے۔ اور وہ طریقے بھی بتا دیئے ہیں جن سے لوگ بادشاہتیں حاصل کرتے ہیں۔ اور حاصل کرنے کے بعد انہیں اپنے قبضے میں رکھتے ہیں۔ اب باقی رہا حملہ اور مدافعت کے ذرائع کا بیان۔

ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ بادشاہ کے لئے ریاست کی بنیادوں کا استوار کرنا کتنا ضروری ہے۔ اس لئے کہ وہ اس کے بغیر تباہ نہ ہو یہ ممکن نہیں۔ ریاستیں خواہ نئی ہوں خواہ پرانی یا مخلوط۔ بنیادی چیزیں ہیں: اچھے قوانین اور اچھی فوج، مگر اچھے قانون بغیر اچھی فوج کے ممکن نہیں۔ البتہ

اچھی فوج ہو تو اچھے قانون بھی ہوں گے۔ فی الحال مجھے
قوانین سے بحث نہیں۔ صرف فوجوں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔
میرا خیال ہے کہ فوجیں جن سے بادشاہ اپنی ریاست کی
مدافعت کرتا ہے کبھی خود اس کی ہوتی ہیں اور کبھی وہ مشتمل
ہوتی ہیں۔ زر آشناؤں یا امدادیوں یا دونوں پر۔
زر آشنا اور امدادی افواج بیکار بھی ہوتی ہیں اور خطرناک
بھی۔ جو بادشاہ اپنی ریاست کی بنیاد ان فوجوں پر
رکھے گا اسے کبھی پائداری اور سلامتی نصیب نہ ہوگی۔
ان لوگوں میں آپس میں نفاق ہوتا ہے۔ انہیں ہوس تو بہت
ہوتی ہے۔ پر انضباط نہیں ہوتا۔ وفا ان میں نام کو بھی نہیں
ہوتی۔ دوستوں کے سامنے بڑے مردانگی کے دعوے کرتے
ہیں لیکن جہاں دشمن سامنے آیا وہ بھاگے۔ انہیں نہ خدا
کا خوف ہوتا ہے نہ انسان کا پاس۔ حملہ ہوتے ہی [illegible]
دیتے ہیں۔ غرض امن کے دنوں میں تمہیں یہ لوٹتے ہیں اور
جنگ کے زمانے میں دشمن۔ واقعہ یہ ہے کہ ان کو بادشاہ
سے دلی تعلق نہیں ہوتا کہ اس کے لئے اپنی جانیں کھپا دیں۔
دو چار ٹکوں کی خاطر بھلا کوئی اپنی جان قربان کیا کرتا ہے۔
جب جنگ نہیں ہوتی وہ شوق سے فوج میں بھرتی ہوتے
ہیں۔ مگر جب لڑنے کا وقت آتا ہے تو ایسے دم دبا کر بھاگتے

ہیں کہ پھر کہیں ان کا پتہ نشان نہیں ملتا۔ اس دعوے کا ثبوت ذرا بھی مشکل نہیں۔ اطالیہ کی بربادی کا سبب سوائے اس کے اور کچھ نہ تھا کہ اس نے اپنی تمام اُمیدیں ایک عرصہ تک زرآشنا فوجیوں سے وابستہ رکھیں۔ اور گو پہلے پہل جب ایک دوسرے کا مقابلہ تھا تو انہوں نے کچھ اپنی بہادری دکھائی۔ لیکن جب غیر ملکوں سے مقابلہ ہوا تو ان کی ساری حقیقت کھل گئی۔ چنانچہ چارلس، شاہ فرانس نے اطالیہ پر قبضہ کیا ہے تو اس کے ہاتھ میں کھریا کا ایک ٹکڑا تھا[1] جس کسی نے یہ کہا ہے[2] کہ اس کا سبب خود ہمارے پاپ تھے بالکل سچ کہا ہے۔ مگر پاپ وہ نہ تھے جو کہنے والے کے خیال میں آئے۔ پاپ وہ تھے جن کا میں نے ذکر کیا ہے۔ اور پاپی چونکہ بادشاہ تھے اس لئے سزا بھی انہیں کو بھگتنی پڑی۔

چاہتا ہوں کہ ان فوجوں کے ناکارہ پن کو ذرا اور

---

[1] اشارہ ہے الکزانڈر ششم کے ایک لطیفہ کی طرف۔ اس نے چارلس ہشتم کے ہاتھوں اطالیہ کی فتح کے متعلق یہ کہا تھا۔ کہ اس فرانسیسی بادشاہ کو تلواروں کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ اس لئے کہ اس کا کسی نے مقابلہ ہی نہیں کیا۔ فرانسیسیوں کے ہاتھوں میں تو کھریا کے ٹکڑے تھے۔ جن سے انہوں نے سپاہیوں کو گھروں میں ٹہرانے کے لئے نشان کر لئے۔

[2] غالباً ساوونارولا کے الفاظ ہیں۔

واضح کروں۔ ان کرائے کی فوجوں کے سردار لایق ہوتے ہیں یا نالایق۔ لائق ہیں تو ان پر بھروسہ کیسے کیا جا سکتا ہے؟ انہیں تو اپنی عظمت و مرتبہ بلند کرنے کی فکر لگی رہتی ہے یا اپنے آقا کو دبا کر یا آقا کی مرضی کے خلاف دوسروں پر ظلم کرکے۔ اور اگر سردار لائق نہیں تو پھر یہ نالایقی بادشاہ کی تباہی کا سبب بن جائے گی۔

اگر کوئی یہ کہے کہ ہاتھوں میں ہتھیار رہوں تو سب ایک ہی طرح لڑتے ہیں، روپے کی خاطر لڑنے والے ہوں تب اور نہ ہوں تب۔ تو میں یہ جواب دوں گا کہ جب بھی کسی بادشاہ یا جمہوریت کو جنگ کی ضرورت پیش آئے تو بادشاہ کو چاہئے کہ خود میدان میں اترے اور فوج کی کمان اپنے ہاتھ میں لے۔ اور جمہوریت ہو تو اپنے شہریوں میں سے کسی کو بھیجے۔ اگر وہ قابلِ اطمینان ثابت نہ ہو تو اُسے واپس بلا لیا جائے۔ اور اگر لائق نکلے تو اُسے اس خدمت کو انجام دینے پر قانون کے ذریعے مجبور کیا جائے۔ تجربے سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ جو بادشاہ اور جمہوریتیں اپنے بل بوتے پر صرف ہوئیں انہیں بڑی بڑی کامیابیاں ہوئیں۔ اور جنہوں نے زر آشناؤں کو نوکر رکھا انہیں ہمیشہ نقصان اٹھانا پڑا۔ تجربہ بھی ہے کہ بدیسی سپاہیوں کی فوج کے بجائے اگر جمہوریت

کی اپنی فوجیں ہوں تو اس پر کسی ایک شہری کا قبضہ زیادہ مشکل ہوگا۔ روما اور اسپارٹا دونوں مسلح اور آزاد رہے سوئٹزرلینڈ کے باشندے آج بھی کامل طور پر مسلح اور آزاد ہیں۔

زمانہ قدیم میں زر آشناؤں کی مثالیں کارتھیجیوں میں ملتی ہیں۔ روما سے پہلی جنگ کے بعد ان پر زر آشنا سپاہیوں نے کیا جو مقدونیہ کے نہ تھے بلکہ فوجوں کے سردار خود کارتھیج کے شہری تھے۔ ایپا منونداس کی موت کے بعد اہل تھیبز نے فلپ مقدونی کو اپنے سپاہیوں کا سردار بنایا فتح کے بعد اس نے ان کی آزادی چھین لی۔

اسی طرح جب ڈیوک فلپو[1] کا انتقال ہوگیا اور میلانیوں نے اہل وینس کے خلاف فرانسسکو اسفورزا کو نوکر رکھا اور اس نے ان کو کاراواژ پر[2] شکست دینے کے بعد اپنے آقاؤں یعنی میلانیوں کو چھوڑ دینے کی خاطر انھیں سے اتحاد کر لیا۔ اس کا باپ اسفورزا نیپلس کی ملکہ ژیووانا کا ملازم تھا۔ مگر جب وقت آیا تو اس نے ملکہ کو اپنے حال

---

[1] موت ۱۳ اگست ۱۴۴۷ء کو واقع ہوئی

[2] ۱۵ ستمبر ۱۴۴۸ء کو واقع ہوئی۔

کرنا پڑے گی کہ اگر اسے کامیابی ہوتی تو اہل فلورنس بالکل اس کے قبضۂ قدرت میں ہوتے۔ یہ پیشی ہمیشہ سفورزا کے خلاف رہتے۔ اس وجہ سے وہ ایک دوسرے کو مشتبہ نظروں سے دیکھتے رہتے۔ فرانسسکو کی توجہ لومبارڈی کی طرف رہی۔ اور برا چیو کی کیپا اور نیپلس کی طرف۔ اب ذرا اور قریب آیئے۔ اہل فلورنس نے اپنی فوج کا سردار پاولو وتیلی کو بنایا۔ آدمی بہت دانا تھا۔ معمولی حیثیت سے ترقی کرکے اس نے بڑی شہرت حاصل کی۔ وہ پیسا کو فتح کرلیتا تو اس سے انکار کی گنجائش نہیں کہ اہل فلورنس پوری طرح اس کے قابو میں آجاتے۔ اس لئے کہ اگر وہ اس کے دشمنوں سے ساز باز کرتے تو تباہ ہوتے اور اگر اس کا ساتھ دیتے تو اس کی کامل اطاعت کے سوا چارہ نہ تھا۔

اگر اہل وینس کی قوت کے فروغ پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ انہوں نے اپنے معاملات کو اس وقت تک ناموری اور سلامتی سے سرانجام دیا جب تک کہ ان کی تمام رعایا بلا فرق اعلیٰ و ادنیٰ کے ان کی جنگوں میں شرکت کرتی رہی — یہ صورت اس وقت تک

---

ملہ ان دونوں خاندانوں میں مدتوں تک یہ چشمک جاری رہی۔

قایم رہی جب تک کہ انھوں نے اپنا رخ خشکی کی طرف نہیں کیا۔ لیکن جب انھوں نے خشکی پر جنگیں شروع کیں۔ تو انھوں نے ان طریقوں کو خیرباد کہا جن میں وہ ماہر تھے اور محض اطالیہ کے طریقوں پر چلنے پر اکتفا کی۔ شروع شروع میں جبکہ براعظم پر ان کے مقبوضات میں اضافہ ہوا تو اس وجہ سے کہ ان کے پاس علاقہ محدود تھا اور ان کی شہرت کا ڈنکا چاردانگ عالم میں بج رہا تھا۔ انہیں اپنے سپہ سالاروں کی طرف سے کسی قسم کا خطرہ نہ تھا۔[1] مگر جب ان کے علاقے وسیع ہوئے۔ جیسا کہ کارمانولا کے راج میں واقع ہوا[2] تو انہیں اپنی غلطی کا پتہ چلا۔ پہلے تو اس نے بہت بہادری اور لیاقت کا ثبوت دیا۔ اس کی سرکردگی میں اہلِ وینس نے ملان کے ڈیوک کو شکست دی۔[3] مگر اس کے بعد اس نے جنگ میں سستی برتی۔ اس پر اہلِ وینس کو یہ قطعی طور پر معلوم ہوگیا کہ اب اس کے ذریعہ فتوحات ممکن نہیں۔ ممکن کیسے ہوں، جب وہ خود ہی فتح کرنا نہ چاہے۔ اسے برخاست کرنا یوں ممکن

---

[1] اشارہ ہے تریویزو کی فتح کی طرف۔ ۱۳۳۹ء

[2] یہ صورت پیدا ہوئی برگامو اور بریسچیا کی فتح یعنی ۱۴۲۸ء کے بعد

[3] جنگ ۱۱ اکتوبر ۱۴۲۷ء کو مکلیو دیو کے قریب لڑی گئی۔

نہ تھا کہ جو کچھ فتح ہو چکا تھا اس کے بھی ہاتھ سے نکلنے کا خوف تھا۔ چنانچہ اس سے اپنے آپ کو بچانے کی بس یہی ایک صورت تھی کہ اُسے موت کے گھاٹ اتار دیا جائے[1]۔ اس کی موت کے بعد اہل وینس کے کئی سپہ سالار ہوئے۔ برگامو کا بارتولومیو، سین سیویرینو کا روبرتو[2]، کاؤنٹ آف پیٹیلیانو[3] وغیرہم۔ ان سپہ سالاروں کے ماتحت فتوحات کا ذریعہ تھا۔ خطرہ تھا شکستوں کا ... ... کی ... ت ... کیجئے۔ کہ جہاں ایک معرکہ میں وہ سب کچھ کھو بیٹھے جو انہوں صدیوں کی کوششوں سے حاصل ہوا تھا۔ بات یہ ہے کہ زرآشنا سپاہ کی مدد سے نفع آہستہ آہستہ اور دیر سے پہنچتا ہے۔ اور نفع ہوتا بھی تھوڑا ہے مگر نقصان ناگہانی ہوتا ہے اور انسان ہکا بکا رہ جاتا ہے۔

جو جو مثالیں میں نے ابھی دی ہیں وہ چونکہ اطالیہ سے متعلق ہیں۔ اور اطالیہ پر بہت عرصہ سے زرآشنا سپاہ کی حکومت رہی ہے۔ اس لئے میری خواہش ہے کہ اس

---

[1] ۵ مئی ۱۴۳۲ء کو اس کا سر تن سے جدا کر دیا گیا۔
[2] فرانسسکو اسفورزا نے ۱۴۴۴ء میں اسے شکست دی۔
[3] فرارا کے خلاف جو جنگ ۱۴۸۲ء میں ہوئی اس میں یہی سپہ سالار تھا۔
[4] ۱۵۰۹ء میں وائیلا کے نزدیک کمبرائی لیگ کی افواج کو شکست فاش دی۔

مسئلے کی تہ تک پہنچوں۔ ان سپاہ کی ابتدا اور نشو ونما کا پتہ چل جائے گا۔ تو پھر آسانی سے ان کی اصلاح بھی ہو سکے گی۔ بس یوں سمجھیے کہ اس پچھلے دور میں شہنشاہی اختیار کو اطالیہ نے رد کرنا شروع کیا۔ اور پوپ کی دنیاوی طاقت کا زیادہ لحاظ ہونے لگا۔ تو اطالیہ یکا یک بہت ساری ریستوں میں تقسیم ہو گیا۔ کتنے ہی بڑے شہروں نے اپنے امراء کے خلاف علم بغاوت بلند کیے۔ ان امراء کے خلاف جنہوں نے شہنشاہ کے بل بوتے پر انہیں اپنا تابع بنا رکھا تھا۔ کلیسا نے ان کی مددیوں کی کہ اس سے خود کلیسا کی دنیاوی طاقت میں اضافہ ہوتا تھا۔ بہت سے دوسرے شہروں میں شہری بادشاہ بن بیٹھے۔ اس طرح جب اطالیہ پوری طرح کلیسا اور بعض جمہوریتوں کے زیر نگیں آ گیا۔ تو اس وجہ سے کہ کلیسا مشتمل تھا پادریوں پہ اور جمہوریتیں مشتمل تھیں ایسے شہریوں پر جنہیں ہتھیاروں سے سابقہ نہیں پڑا تھا۔ غیر ملکیوں کو ملازم رکھنا شروع کیا۔ پہلا شخص جس نے ان فوجوں کا رتبہ بڑھایا وہ روماناکے شہر کونیو کا باشندہ البریگو[1] تھا۔ اسی کے تیار کردہ

---

[1] چودھویں صدی کے آخیر کا آدمی ہے۔ پہلا شخص ہے جس نے کپ بنیادی سان جرجیو نام کی خاص اطالوی فوجیں تیار کیں۔

لوگوں میں بر اچیو اور اسفورزا تھے۔ جو اپنے زمانہ میں اطالیہ کی قسمت کے مالک تھے۔ ان کے بعد اب تک اسی قبیل سے کتنے ہی لوگ ہوئے جو زرآشنا سپاہ کے سردار ہوئے یہ انہیں کے کرتوت ہیں کہ ہمارے ملک پر چارلس[1] نے دھاوا بولا۔ لوئیس[2] نے اسے لوٹا کھسوٹا، فرڈیننڈ[3] نے تباہ و برباد کیا اور اہل سوسٹان کے ہاتھوں اس کی توہین ہوئی۔

اِن زرآشنا سپاہ کا پہلا مقصد یہ تھا کہ پیادہ فوج کو بدنام کریں تاکہ خود اُن کی اہمیت دوبالا ہو۔ چنانچہ ان کو دل کھول کر بدنام کیا۔ ان کے پاس اپنی کوئی جائیداد تو تھی نہیں، ان کا گزارہ اسلحہ کے استعمال پر تھا۔ اب تھوڑی سی پیادہ فوج اُن کے ماتحت رہتی تو ان کی عزت کیا خاک ہوتی۔ اور تعداد زیادہ ہوتی تو ان کا پیٹ کون بھرتا؟ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے سوار فوج کو پیادہ فوج پر ترجیح دی۔ سوار فوج مختصر بھی ہو تو اس سے عزت وافتخار ممکن ہے۔ اور اس کی پرداخت زیادہ آسان ہے۔ آخرش حالت بایں جارسید کہ فوج کی تعداد بیس ہزار

---

[1] مراد ہے چارلس ہشتم شاہ فرانس ۱۴۸۳ء تا ۱۴۹۸ء
[2] لوئیز دوازدہم شاہ فرانس ۱۴۹۸ء تا ۱۵۱۵ء
[3] فرڈیننڈ شاہ ہسپانیہ ۱۴۷۹ء تا ۱۵۱۶ء فاتح نیپلس۔

تھی اور اس میں دو ہزار بھی پیادہ سپاہی نہ تھے۔ اس کے علاوہ وہ اپنے آپ کو اور اپنی فوج کو تکان اور خطرہ سے محفوظ رکھنے کی ہر ممکن کوشش کرتے تھے۔ جنگ میں ایک دوسرے کو قتل نہ کرتے تھے، قید کر لیا کرتے تھے جو بعد میں بغیر فدیہ کے رہا کر دیئے جاتے تھے۔ کسی شہر پر بھی رات کے وقت حملہ نہ کرتے تھے۔ اور خود شہر کے اندر ہوتے تو رات کو جو محاصرہ کئے ہوئے ہو اس پر دھاوا نہ بولتے تھے۔ ان کے پڑاؤں کے چاروں طرف نہ فصیلیں ہوتی تھیں نہ خندقیں۔ سردی کے موسم میں جنگ سے سروکار نہ رکھتے تھے۔ ان کے فوجی قوانین سے ان سب باتوں کی تائید ہوتی تھی۔ اور جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں یہ سب اس وجہ سے کہ تکان اور خطرہ اُن کے پاس پھٹک کر نہ آئے۔ اسی کا نتیجہ اطالیہ کو غلامی اور ذلت کی صورت میں بھگتنا پڑا۔

# باب ۱۳

## امدادی، مخلوط اور قومی سپاہ

بیکار سپاہ کی دوسری قسم امدادیئے ہیں۔ ان سے میری مراد وہ فوجیں ہیں جو بادشاہ جس سے امداد طلب کی جائے۔ مدد اور مدافعت کے لئے لے کر آئے۔ مثلاً زمانہ قریب میں جب پوپ جولیس دوم نے دیکھا کہ اس کے زر آشنا سپاہی فرارا کی مہم میں نکمے ثابت ہوئے تو اس نے امدادیوں سے کام نکالنا چاہا۔ اور فرڈی نینڈ شاہ اسپین سے سوار اور پیدہ سپاہیوں کے حاصل کرنے کا انتظام کیا[1]

ممکن ہے کہ امدادیئے بہترین سپاہی ہوں اور اپنے لئے کار آمد بھی ہوں مگر جو کوئی انہیں مدد کے لئے

---

[1] اشارہ ہے "مقدس لیگ" کی طرف جو ۱۵۱۱ء میں لوئی دوازدہم شاہ فرانس کے خلاف قائم ہوئی۔

بلاتا ہے وہ عموماً نقصان ہی میں رہتا ہے۔ اس لیے کہ اگر انہیں شکست ہوتی ہے تب وہ مارا جاتا ہے اور اگر فتح ہوتی ہے تو ان کا قیدی ہو جاتا ہے۔ قدیم تاریخیں اس قسم کی مثالوں سے بھری پڑی ہیں۔ مگر پوپ جولیس کی یاد ابھی لوگوں کے دلوں میں تازہ ہے۔ میں اس کا ذکر کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہ اس کی انتہائی نادانی تھی کہ فرارا کو حاصل کرنے کی خاطر جس کے لئے وہ بے چین تھا، اس نے اپنے آپ کو ایک غیر ملکی کے ہاتھ بیچ ڈالا۔ یہ اس کی خوش نصیبی تھی کہ وہ بچ نکلا۔ اور اس کو اپنے غلط اعتماد کا نتیجہ بھگتنا پڑا۔ اس لیے کہ جب رودینا[1] پر اس کے امدادیوں کو شکست ہوئی تو اہل سوئٹزرستان نے یکایک ہتہ بول دیا[2]۔ اور خود اپنی اور دوسروں کی توقع کے بالکل خلاف فاتحوں کو ملک سے نکال باہر کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نہ تو وہ اپنے دشمنوں کے ہاتھوں میں قیدی بنا۔ قیدی کیسے بنتا جبکہ دشمن خود ہی فرار ہو گئے۔

---

[1] یہ شکست ۱۱ اپریل ۱۵۱۲ء کو فرانسیسیوں کے ہاتھوں ہوئی۔ جن کا سپہ سالار گاسٹون دے فوا تھا اور جو اس لڑائی میں کام آیا۔

[2] اس موقع پر بیس ہزار سوئٹزرستانی امدادی پیادوں نے شرکت کی۔ ان کی مداخلت سے صورت حالات نے ایسا پلٹا کھایا کہ فرانسیسیوں کو اطالیہ چھوڑتے ہی بنی۔

اور نہ اپنے مددگاروں کا قیدی بنا اس لئے کہ فتح ان کے زور بازو کا نہیں۔ مددگاروں کے زور بازو کا نتیجہ تھی۔ جب اہلِ فلورنس کے پاس خود اپنی کوئی فوج نہ رہی تو وہ دس ہزار فرانسیسی سپاہی پیسا کے محاصرہ کے لئے لائے۔ اور اس طرح اپنے آپ کو ایسے بڑے خطرے میں ڈالا جیسا پہلے کسی موقع پر نہ ڈالا تھا۔ اسی طرح اپنے آپ کو ہمسایوں سے بچانے کے لئے شہنشاہ قسطنطنیہ نے دس ہزار ترک سپاہیوں کو یونان میں بلایا۔ لڑائی ختم ہو گئی مگر وہ نہ گئے۔ اس طرح ان بے دینوں کے ماتحت یونان کی غلامی کی ابتدا ہوئی۔ پس جو کوئی فتح سے ہاتھ دھو بیٹھنا چاہے وہ امدادی فوج سے کام لے۔ امدادی فوج زر آشنا سپاہ سے کہیں زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔ تباہی ان کے ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ وہ خود متحد ہوتے ہیں اور اپنے افسروں کے حکم پر چلتے ہیں۔ اور زر آشنا اگر فتح پانے کے بعد نقصان پہنچانا بھی چاہیں تو اس کے لئے

---

لہ ایک کامیاب حملہ کے بعد ان فوجوں نے بغاوت کی اور آخر میں معاملہ چھوڑ بھاگیں

لہ ۱۳۴۶ء میں اپنی مدافعت کے لئے شہنشاہ نے ترکوں کے ساتھ ایک معاہدہ کیا۔ اور سلطان سلیمان کے زمانہ میں دس ہزار ترک یورپ میں داخل ہوئے۔ ۱۳۵۴ء میں شہنشاہ اس دنیا سے سدھار گیا مگر ترک وہاں سے نہ نکلے۔

زیادہ وقت درکار ہوتا ہے۔ اور بہتر موقعوں کی ضرورت ہوتی ہے اس لئے کہ وہ خود مختلف کمپنیوں میں منقسم ہوتے ہیں جنہیں بادشاہ خود بھرتی کرتا ہے اور جن کو اپنے پاس سے تنخواہیں دیتا ہے۔ ان کے افسر اعلیٰ کے لئے جسے بادشاہ خود مقرر کرتا ہے یہ ممکن نہیں کہ ان میں ایسا اثر پیدا کرلے جو اس کے لئے خطرہ کا باعث ہو۔ مختصر یہ ہے کہ زر آشنا سپاہ سے خطرہ ہوتا ہے ان کی بزدلی کی وجہ سے اور امدادی سپاہ سے ڈر ہوتا ہے ان کی بہادری کے سبب۔ اسی لیے ذی عقل بادشاہ ہمیشہ ان سپاہ سے پرہیز کرتے ہیں اور خود اپنی فوج پر بھروسہ کرتے ہیں۔ پھر اگر شکست بھی ہو تو اسے فتح پر ترجیح حاصل ہے جو غیروں کی مدد سے ہو۔ وہ اس فتح کو جو دوسروں کی سپاہ سے حاصل کی جائے سچی فتح ہی نہیں سمجھتے۔

سیزرے بورژیا اور اس کے کاموں کی مثال دینے سے میں کبھی نہیں چوکوں گا[1]۔ رومانا میں وہ امدادی فوج لے کر داخل ہوا۔ امدادی سب کے سب فرانسیسی سپاہی تھے۔ ان کی مدد سے اس نے اِمولا اور فورلی کو فتح کیا۔ مگر بعد میں جب اس نے دیکھا کہ ان فوجوں پر

---

[1] ملاحظہ ساتواں باب۔

اعتبار نہیں کیا جا سکتا تو ان کی جگہ اس نے زرِ آشنا سپاہی رکھے کہ اُن سے اُس کے خیال کے بموجب کم خطرہ تھا۔ اس نے آرسینی اور ڈیتیلی کو نوکر رکھا۔ جب انہیں بھی اُس نے ناقابلِ اعتبار، دغا باز اور خطرناک پایا تو ان سے بھی نجات حاصل کی۔ اور ان فوجوں پر بھروسہ کیا جو اس نے خود بھرتی کی تھیں۔ ان مختلف اقسام کے سپاہیوں کا فرق اچھی طرح واضح ہو جائے گا اگر ہم ڈیوک کی شہرت پر نظر ڈالیں جو اسے اس وقت حاصل تھی جب وہ فرانیسی سپاہ کا سہارا لیئے ہوئے تھا۔ اور اس کا مقابلہ اُس شہرت سے کریں جو اُسے آرسینی اور ویتیلی کو ملازم رکھنے کے بعد حاصل ہوئی اور پھر اس شہرت سے جو اُسے اس وقت حاصل ہوئی جب اس کا دارومدار اپنی فوجوں اور اپنے وسائل پر ہوا۔ اس طرح جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو اس کی شہرت بڑھتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ اور یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اس نے سب سے زیادہ ناموری اسی وقت حاصل کی جب ہر ایک کو یہ احساس ہوا کہ وہ اپنی فوج کا تنِ تنہا مالک ہے۔

میری خواہش تھی کہ بس اطالیہ کی جدید تاریخ سے مثالیں اخذ کروں۔ مگر میں ہیرو سائراکیوزی[۱] کا

[۱] ۔ تیرہویں باب میں ذکر آ چکا ہے۔ ملاحظہ ہو متعلقہ حاشیہ۔

ذکر کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میں پہلے بتا چکا ہوں جب اسے اہل سائرا کیوز نے اپنا سپہ سالار بنایا تو اس نے فوراً ہی اندازہ کر لیا کہ زر آشنا سپاہ سے کام نہیں چل سکتا۔ اس لئے کہ ان کے سردار ایسے ہی تھے جیسے اطالوی "کون دوتیری" دقت یہ تھی کہ نہ تو انھیں رکھا ہی جا سکتا تھا اور نہ انھیں علیحدہ کرنا ہی ممکن تھا۔ چنانچہ اس نے سب کو تہ تیغ کر دا ڈالا۔ اور بعد میں جو جنگیں کیں ان میں ملکی سپاہیوں سے کام لیا۔ اور دوسروں سے کسی قسم کی مدد نہیں لی۔

توراۃ میں اس مضمون کا ایک بہت خوب ٹکڑا ہے۔ جس کی طرف میں توجہ دلانا چاہتا ہوں۔ جب حضرت داؤد نے اپنی خدمات جالوت فلسطینی کے خلاف جنگ کرنے کے لئے ساؤل کو پیش کیں تو ساؤل نے ان کی ہمت بڑھانے کے لئے اُن کو خود اپنے زرہ بکتر سے مسلح کیا۔ مگر اسلحہ پہنتے ہی انہوں نے فرمایا کہ معاف کیجئے ایسے ناآزمودہ ہتھیاروں سے غالب آنا میرے بس کی بات نہیں۔ دشمن کے ساتھ لڑنا ہو تو میں اپنی گوفان اور تلوار ہی کو ترجیح دیتا ہوں۔ بات یہ ہے کہ دوسروں کے ہتھیار یا تو اپنے لئے بہت بڑے ہوں گے یا بہت تنگ کبھی وہ گر پڑیں گے۔ کبھی رکاوٹ پیدا کریں گے اور کبھی اپنے بوجھ سے دبالیں گے۔

لوئیز نہم کے والد چارلس ہفتم[1] جس نے اپنی خوش طبعی اور شجاعت کی مدد سے فرانس سے انگریزوں کو نکالا۔ اُسے بھی اس ضرورت کا احساس تھا کہ قومی فوج کے ذریعہ اپنی طاقت بڑھائے۔ اس نے ایسے قوانین مرتب کئے جن میں سوار اور پیدل فوج دونوں کے لئے قواعد وضوابط مقرر کئے گئے تھے مگر بعد میں اس کے بیٹے شاہ لوئیز نے پیادہ فوج کو برطرف کر دیا۔ اور سوستانی زر آشنا سپاہیوں کو نوکر رکھنا شروع کر دیا[2]۔ یہی غلطی بعد کے بادشاہوں نے بھی کی اور جیسا کہ نتائج سے ظاہر ہے[3]۔ یہی وجہ تھی ان خطرات کی جن سے فرانس کو دوچار ہونا پڑا سوستانی فوجوں کی شہرت بڑھنے سے فرانس کی تمام قومی سپاہ کی حالت بدتر ہوتی گئی۔ فرانسیسی پیادہ فوج کے ختم ہونے سے فرانس کی سوار فوج غیر ملکیوں کی دستِ نگر ہوگئی۔ سوستانی سپاہیوں

---

[1] چارلس ہفتم۔ شاہ فرانس ۱۴۲۲ء تا ۱۴۶۱ء ۔ ۱۴۴۵ء میں اس نے ایک ایسے رسالہ کی بناڈالی جو خبر رساں پر مشتمل تھا اور ۱۴۴۸ء میں پیادہ فوج تیار کی۔

[2] معاہدہ مورخہ ۷ جنوری ۱۴۷۴ء کی رو سے اس کو سوستانی سپاہ بھرتی کرنے کا حق حاصل ہوا۔

[3] کتاب بادشاہ، اطالیہ سے فرانسیسیوں کے اخراج کے ایک سال بعد تصنیف ہوئی۔

سے اس کا ساتھ اتنا رہا کہ وہ یہ سمجھنے لگی کہ وہ سوستانیوں کے بغیر کچھ نہیں کر سکتی۔ اب حالت یہ ہے کہ فرانسیسی کسی طرح سوستانیوں کے ہم پلہ نہیں۔ اور ان کے بغیر دوسروں پر ہرگز غالب نہیں آ سکتے۔

مدہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ فرانس کی فوج مخلوط ہے۔ اس کا ایک حصہ قومی سپاہ پر مشتمل ہے۔ اور ایک حصہ زر آشنا سپاہ پر۔ اس قسم کی فوجیں اُن فوجوں سے تو بہت بہتر ہوتی ہیں جو محض زر آشنا یا امدادی سپاہ پر مشتمل ہوں۔ مگر خالص قومی سپاہ کے مقابلہ میں نہایت گھٹیا ہوتی ہیں۔ خود فرانس کی مثال فیصلہ کن ہے۔ چارلس ہفتم کے فوجی قوانین برقرار رکھے گئے ہوتے اور انہیں اور وسعت دی گئی ہوتی تو کوئی بھی ملک فرانس کا بال بیکا نہیں کر سکتا تھا۔ مگر دور اندیشی کی کمی کے سبب لوگ بعض اوقات ایسی تبدیلیاں عمل میں لاتے ہیں جو بظاہر اچھی معلوم ہوتی ہیں اور شروع شروع میں جن کی چھپی ہوئی خرابیوں کا پتہ نہیں چلتا۔ وہی تپ دق کا سا معاملہ ہوتا ہے۔ جس کا ذکر کر چکا ہوں۔ مگر اتنی بات ضرور ہے کہ جو حاکم پہلے سے آنے والی خرابیوں کا اندازہ نہ لگا سکے اُسے بہت خردمند نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ یہ وصف بہت کم لوگوں کو ودیعت

ہوا کرتا ہے۔

سلطنت روما کے زوال کے اسباب کو تلاش کیا جائے
تو معلوم ہوگا کہ زوال کی ابتداء زر آشنا گاتھک[۱] سپاہ کو نوکر
رکھنے سے ہوئی۔ اِدھر انہیں نوکر رکھا اور اُدھر اہل روما
کی قوت گھٹنا شروع ہوئی۔ اور ان میں جو جو خوبیاں تھیں۔
وہ گاتھوں میں منتقل ہوگئیں۔ مختصر یہ ہے کہ بغیر قومی سپاہ
کے کوئی بھی بادشاہت محفوظ نہیں۔ ایسی بادشاہت کا دارو
مدار بس قسمت پر ہوگا۔ اس لیئے کہ اس کے پاس وہ طاقت
تو ہے ہی نہیں جس سے وہ مصیبت کے وقت اپنی مدافعت
کرسکے۔ اور عقلمند لوگوں کی ہمیشہ سے یہ قطعی رائے رہی
ہے کہ طاقت وجبروت کی اس شہرت سے زیادہ غیر مستحکم
اور عارضی کوئی شے نہیں جس کی بُنیاد خود اپنے زور بازو
پر نہ ہو۔ قومی فوج سے میری مراد ایسی فوج ہے جو مشتمل
ہو اپنی رعایا، شہریوں اور محکوموں پر۔ ان کے علاوہ اور
سپاہ یا زرآشنا ہوگی یا امدادی۔

جن طریقوں سے فوجیں بنا کرتی ہیں اُن کا معلوم کرنا
کچھ دشوار نہیں۔ اگر ان اصولوں پر اچھی طرح عمل کیا

---

[۱] شہنشاہ والینس (۳۷۶ء) اور تھیوڈوسیس (۳۸۲ء)
کے زمانہ میں۔

جائے۔ جن پر متذکرہ بالا چار حاکم[1] عمل پیرا ہوئے اور اس پر بھی غور کیا جائے کہ سکندر اعظم کے والد فلپ اور بہت سے دوسرے بادشاہوں اور جمہوریتوں نے کیونکر فوجیں تیار کیں۔ میرے لئے یہاں پر صرف ان مثالوں کی طرف اشارہ کرنا کافی ہے۔

---

[1] یعنی سیزار سے بورژیا۔ ہیرو۔ چارلس ہفتم اور نبی حضرت داؤد!

# باب ۱۴

## بادشاہ کے جنگی فرائض

بادشاہ کی توجہ کا مرکز صرف ایک ہونا چاہئے۔ اور اس کے دماغ میں بس ایک خیال کے لئے جگہ ہونی چاہئے۔ یعنی جنگ کے لئے۔ اسے مہارت بھی جنگ اور اس کے تمام متعلقات میں پیدا کرنی چاہئے۔ کہ یہی وہ فن ہے جو حاکموں کے لئے موزوں ہے۔ پھر یہ مفید بھی اس قدر ہے کہ اس کی بدولت نہ صرف خاندانی بادشاہ اپنی حکومت قایم رکھ سکتے۔ بلکہ معمولی افراد بھی اس کی مدد سے بادشاہت کے اعلیٰ رتبہ تک پہنچ سکتے ہیں برخلاف اس کے جب بادشاہ جنگ سے توجہ ہٹا لیتے ہیں اور لہو ولعب میں پڑ جاتے ہیں تو وہ اپنے مقبوضات سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ جس طرح اس فن سے بے توجہی تباہی کا سبب ہے۔ اسی طرح اس فن میں مہارت پیدا کرنے سے یقینی

طور پر طاقت حاصل کی جا سکتی ہے۔ یہ فنِ جنگ میں مہارت
ہی تھی جس نے فرانسسکو اسفورزا کو معمولی حیثیت سے بڑھا کر
میلان کا ڈیوک بنایا۔ پھر جب اس کی اولاد کو جنگ کی ہماہمی
نہیں بھائی تو بادشاہت بھی ان کے ہاتھ سے نکل گئی[1] اس
لئے کہ غیر مسلح ہونے کی وجہ سے جہاں اور مصیبتیں آتی
ہیں وہاں یہ بھی ہے کہ لوگ حقیر سمجھنے لگتے ہیں۔ اور یہ وہ
چیز ہے جس سے بچنا بادشاہ کے لئے خاص طور پر ضروری
ہے۔ میں ابھی اس کو اور تفصیل سے بیان کروں گا۔

مسلح اور غیر مسلح آدمی کا مقابلہ کیا؟ اور جب یہ صحیح
ہے تو یہ بات تو خلافِ عقل ہے کہ ایک مسلح شخص ایک غیر
مسلح شخص کی اپنی رضامندی سے اطاعت کرے۔ یا ایسا
غیر مسلح شخص جس کے چاروں طرف مسلح ملازمین ہوں محفوظ
رہے۔ جب ایک طرف حقارت ہو اور دوسری طرف
بے اعتمادی تو صحیح تعاون کیونکر ممکن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ
جو بادشاہ فنِ جنگ سے بے بہرہ ہوگا اُسے اور دقتوں
کے علاوہ کبھی بھی اُس کے سپاہی عزت کی نگاہ سے نہیں

---

[1] اس کے اپنے بیٹے لودویکو ال مورو سے لوئیز دوازدہم نے
میلان چھین لیا۔ اس کی موت ۱۵۰۸ء میں فرانسیسی قید خانہ میں
واقع ہوئی۔

دیکھیں گے۔ اور نہ وہ ان پر اعتماد کر سکے گا۔ پس بادشاہ کو کبھی جنگی مسائل سے توجہ نہیں ہٹانی چاہئیے۔ زمانہ جنگ ہی میں نہیں، امن و امان کے دوران میں اور بھی زیادہ دلچسپی لینی چاہئیے۔ یہ ممکن ہے دو طرح سے، ایک عملی طور پر۔ دوسرے مطالعہ کے ذریعہ۔

جہاں تک عمل کا تعلق ہے اُسے چاہئیے کہ اپنی فوج کو صف آرائی کی عملی تعلیم دے۔ قواعد کی پابندی کرانے علاوہ ازیں اُسے برابر شکار کھیلتے رہنا چاہئیے۔ یہ اس لئے کہ اس کا جسم سختیوں اور تھکان کا عادی ہو۔ اسی کے ساتھ اسے مقامات کا علم حاصل ہو۔ وہ پہاڑوں کے ڈھال، وادیوں کی کشادگی، میدانوں کی وسعتیں دیکھے۔ دریاوں اور دلدلوں سے واقفیت حاصل کرے۔ اور اس مضمون پر زیادہ سے زیادہ توجہ صرف کرے۔ یہ معلومات دو طرح پر اس کے کام آئیں گی۔ اوّلاً اُسے اپنے ملک کی واقفیت ہوگی اور اس کی مدافعت کے طریقوں کی بہتر سمجھ پیدا ہوگی۔ اور دوسرے اپنے ملک کے مختلف مقامات کی واقفیت سے یہ بھی فائدہ ہوگا کہ جن علاقوں کو وہ پہلے سے نہیں جانتا انھیں بھی ذرا سی دیر میں سمجھ سکے گا۔ مثال کے طور پر صوبہ ٹسکنی کی پہاڑیاں، وادیاں،

میدان، دریا اور دلدل ویسے ہی ہیں جیسے کہیں اور کے۔ تو اس صوبہ کے جغرافیۂ طبعی کی معلومات سے اسی قسم کے دوسرے صوبوں کے متعلق معلومات بغیر کسی دقت کے حاصل ہو سکتی ہیں۔ جب بادشاہ کو اس قسم کی معلومات نہ ہوں وہ اچھا سپہ سالار نہیں بن سکتا۔ کہ انہیں معلومات سے اُسے پتہ چلتا ہے کہ دشمن کو کیونکر اچانک آگھیرے۔ لشکر کے پڑاؤ کے لئے جگہ کا کس طرح انتخاب کرے۔ اپنی فوج کے کوچ کی سمت کیسے مقرر کرے۔ اپنی فوج کو جنگ کے لیے کیونکر ترتیب دے اور محاصرہ کس طرح کامیابی کے ساتھ کرے۔

اکائیوں کے بادشاہ فلوپومن[1] کی جہاں مورخوں نے اور تعریفیں کی ہیں ان میں یہ بھی ہے کہ امن و امان کے زمانہ میں جنگ کے طریقوں پر غور و خوض کرتا رہتا تھا۔ جب ملک کے کسی حصہ میں اپنے دوستوں کے ساتھ جاتا تو چلتے چلتے اکثر ٹھہر جاتا۔ اور اس موضوع پر ان سے تبادلۂ خیالات کرتا۔ کبھی یوں کہتا کہ اگر دشمن اس پہاڑی پر ہو اور ہم اپنی قوم کے ساتھ یہاں ہوں تو کون فائدہ میں رہے گا؟ دشمن پر حملہ کرنے کا بہترین طریقہ کیا ہوگا؟ اگر ہمیں پیچھے

---

[1] ۲۵۳ء تا ۱۸۳ء ق-م-

ہٹنا پڑے تو ہیں کون سی راہ اختیار کر لی چاہئے؟ اور اگر وہ پسپا ہوں تو ہیں ان کا کیونکر پیچھا کرنا چاہئے؟ اس طرح فوج کو جو جو صورتیں پیش آسکتی ہیں ان پر چلتے چلتے اپنے دوستوں سے سوال کرتا جاتا۔ اور ان کی رایوں کو غور سے سنتا۔ انھیں اپنی رائے سے آگاہ کرتا اور اپنی رائے کے ساتھ دلیلیں پیش کرتا جاتا اس مسلسل غور وفکر ہی کا نتیجہ تھا۔ کہ میدان جنگ میں ایسی کوئی پیچیدگیاں نہ تھیں جن کا حل اس کے پاس موجود نہ ہو۔

رہی ذہنی تربیت سو بادشاہ کو تاریخی کتابوں کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ اور ان کتابوں میں مشاہیر کے کارناموں کو خاص طور پر ذہن نشین کرنا چاہئے۔ یہ دیکھنا چاہئے کہ وہ جنگوں میں کیا کرتے تھے۔ ان کی فتوحات اور شکستوں کے اسباب پر غور کرنا چاہئے۔ تاکہ جہاں انھیں کامیابی ہوئی ہو وہاں ان کی پیروی کی جاسکے اور ان کی غلطیوں سے احتراز۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ زمانہ گذشتہ کے اکثر اکابر کی طرح وہ نمونہ کے طور پر کسی ایسے شخص کو اپنے سامنے رکھے جو اس سے پہلے غیر معمولی شہرت اور ناموری حاصل کر چکا ہو۔ اسے چاہئے کہ ایسے شخص کے کارنامے ہر وقت اپنے پیش نظر رکھے جس طرح کہا جاتا ہے کہ سکندر اعظم کے سامنے نمونے کے طور پر اچیلیز تھا۔ سیزر کے پیش نظر

سکندر اور سیپیو کے سامنے سائرس۔ اور جو کوئی ایک دفعہ زینوفن کی لکھی ہوئی اس آخر الذکر شخصیت کی سوانح عمری کا مطالعہ کرے گا۔ اس کو بعد میں سیپیو کی زندگی میں پتہ چل جائے گا کہ اس کی کامرانی میں اس تقلید کا کتنا بڑا حصہ تھا۔ اور جیسا کہ زینوفن نے بیان کیا ہے وہ پاکدامنی، حسن اخلاق اور رحمدلی میں سائرس سے کتنا ملتا جلتا تھا۔

دانشمند بادشاہ کو انہیں طریقوں پر عمل پیرا ہونا چاہئے۔ امن و امان کے دوران میں بھی اُسے چین سے نہ بیٹھنا چاہئے۔ بلکہ ایسے زمانہ سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہئے۔ تاکہ آڑے وقت میں یہ محنت کام آئے۔ اور جب قسمت اس کا ساتھ چھوڑ دے تو وہ اس کے تھپیڑوں کا مقابلہ کرنے کے قابل ہو۔

# باب ۱۵

## وہ خصائل جن کی بنا پر لوگوں اور خاص طور پر بادشاہوں کی تعریف یا مذمت ہوتی ہے

اب یہ غور کرنا باقی ہے کہ رعایا اور احباب کی طرف بادشاہ کا کیا رویّہ اور انداز ہونا چاہئیے۔ مجھے پتہ ہے کہ اس موضوع پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور میرا اس پر کچھ لکھنا ممکن ہے بے ادبی کی طرف محمول کیا جائے۔ اور یہ خاص طور پر اس وجہ سے کہ میری رائے اس معاملہ میں دوسروں کی رائے سے بہت زیادہ مختلف ہے۔

مگر جب میرا مقصد یہ ٹھیرا کہ وہ باتیں لکھوں جو میری تصنیف کے سمجھنے والے کے لئے مفید ہوں تو پھر میں بجائے معاملات کی من گھڑت تصویر کے کیوں نہ ان کی سچی تصویر کھینچوں اس لئے کہ بہت سی ایسی بادشاہتیں اور جمہوریتیں ہیں جو کبھی معرض وجود میں نہیں آئیں ان کی خیالی تصویر میں

کھینچی گئی ہے۔ ہماری زندگی کا انداز جیسا ہے اور جیسا ہونا چاہیئے اُن دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اور جو کوئی دوسرے کو اختیار کرنے کی خاطر پہلے کو چھوڑتا ہے وہ نجات کی بجائے اپنی تباہی کی صورت پیدا کرتا ہے۔ اس لیئے کہ ایسی دنیا میں جہاں تمام اِنسان نیک نہیں، ہر معاملہ میں کامل نیکی کو اپنا معیار بنانا اپنے پاؤں پر آپ کلہاڑی مارنا ہے۔ جس بادشاہ کا بادشاہت سے جی کھٹّا نہ ہو گیا ہو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ نیکی کے علاوہ اور بھی کچھ سیکھے۔ اور نیکی کا استعمال موقع محل کے لحاظ سے کر لے۔

اب اگر بادشاہ کے متعلق خیالی تصورات کو الگ کیا جائے۔ اور صرف حقیقی باتوں کو پیشِ نظر رکھا جائے تو میں کہوں گا کہ جب لوگوں کا ذکر ہوتا ہے اور خاص طور پر بادشاہوں کا کہ وہ بہت بلند و برتر سمجھے جاتے ہیں۔ تو اُن کے وہ خصائل گنائے جاتے ہیں جن میں تعریف یا مذمت کا پہلو نکلے۔ مثلاً کسی کو کشادہ دست کہا جاتا ہے۔ اور کسی کو کنجوس (لالچی کی جگہ میں کنجوس استعمال کر رہا ہوں۔ اس لیئے کہ میں اس خصلت کو ظاہر کرنا چاہتا ہوں جس کی بنا پر کوئی شخص اپنی ذاتی دولت خرچ کرنے میں کنجوسی برتے۔ لالچ سے مراد طبیعت کا وہ انداز ہے جس میں دوسروں کے مال

پر انسان کی نظر ہو) ایک کو فیاض بتاتے ہیں، ایک کو لالچی۔ کوئی سنگدل ہوتا ہے، کوئی نرم دل۔ ایک کو بد عہد کہتے ہیں۔ ایک کو بات کا سچا۔ کوئی زنخا اور بزدل، کوئی جانباز اور دلاور۔ کوئی خوش اخلاق، کوئی مغرور۔ ایک آوارہ دوسرا پاک دامن۔ ایک دیانتدار دوسرا فطرتی۔ کوئی مستقل مزاج کوئی متلون۔ کوئی سنجیدہ کوئی چھچھورا۔ کوئی دیندار کوئی بے دین وغیرہ۔ اس سے انکار کی گنجائش نہیں کہ اگر بادشاہ میں وہ تمام متذکرہ بالا اوصاف ہوں جو اچھے شمار کیئے جاتے ہیں۔ تو یہ بہت ہی قابل تعریف بات ہوگی مگر ان تمام خوبیوں کا اس میں جمع ہونا یا اس کا ان پر عمل پیرا ہونا تو ناممکن ہے کیونکہ انسانی فطرت کا تقاضا ہے۔ اور جب یہ صورت ہے تو بادشاہ کو چاہیئے کہ وہ اپنے آپ کو ایسی بدنامی سے بچائے جس سے اس کے تخت کے چھن جانے کا ڈر ہو۔ یہی نہیں، ممکن ہو تو اس بدنامی سے بھی بچے جس سے اس قسم کا خطرہ نہ ہو اور اگر پوری طرح بچ نہ سکے تو مضائقہ نہیں۔ لیکن اگر اس کی بدنامی ایسی برائیوں کی وجہ سے ہو جن کے بغیر حکومت قائم نہ رہ سکتی ہو تو اس کی اسے ذرا پرواہ نہیں کرنی چاہیئے۔ اس لیئے کہ

اگر وہ ان معاملات پر اچھی طرح غور کرے گا تو اُسے معلوم ہو گا کہ بعض اوقات ایسا طرزِ عمل جو بظاہر اسے اچھا معلوم ہوتا ہے اس کی تباہی کا موجب ہوتا ہے۔ برخلاف اس کے ایسا طرزِ عمل جو ظاہر میں بُرا دکھائی دیتا ہے اس کی سلامتی اور خوش حالی کا سبب بنتا ہے۔

# باب ۱۶

## کشادہ دستی اور کنجوس

پہلے کشادہ دستی کو لیجئے۔ کشادہ دست مشہور ہونا اچھا
ہے۔ مگر دقت یہ ہے کہ کشادہ دست مشہور ہونے کی کوشش
میں اپنے آپ کو نقصان پہونچتا ہے۔ اس لیئے کہ اگر اچھے
کاموں میں صرف بھی کیا جائے تو لوگوں کو معلوم نہیں ہو پاتا
اور کنجوس کے الزام سے برئیت نہیں ہوتی۔ پس دنیا میں
کشادہ دست مشہور ہونے کے لیئے بڑی شان وشوکت
سے رہنا پڑتا ہے۔ اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو بادشاہ کشادہ
دست خیال کیا جاتا ہے اس کی تمام دولت اسی قسم کی
چیزوں پر صرف ہو جاتی ہے۔ اور آخیر میں اپنی اس
شہرت کو قائم رکھنے کے لیئے وہ مجبور ہو جاتا ہے کہ اپنی
رعایا پر غیر معمولی محصول لگائے۔ جائدادیں ضبط کرے
اور روپیہ وصول کرنے کی ایسی قسم کی اور ترکیبوں سے کام

ے۔ مگر اس طرح رعایا اس سے نفرت کرنے لگتی ہے۔
ور جب اُس کے پاس دولت کی فراوانی نہیں رہتی تو
وگوں کی نظر میں اُس کی عزت بھی خاک میں مِل جاتی ہے۔
س طرح جب اپنی کشادہ دستی سے بہت سوں کو ناراض
ور تھوڑوں کو خوش کرپاتا ہے تو اپنے آپ کو اس سے کچھ
ہتر نہیں پاتا جہاں پہلے تھا۔ اور جن خطرات کا اُسے شروع
ں سامنا تھا وہ ویسے کے ویسے ہی باقی رہتے ہیں۔ پھر
ب اُسے اِس کا پتہ چلتا ہے اور وہ اس راہ سے پلٹنا
ہتا ہے تو اس پہ کنجوسی کا الزام لگتا ہے۔

پس چونکہ بادشاہ کے لیئے یہ ممکن نہیں کہ اپنے آپ
نقصان پہنچائے بغیر کشادہ دستی کے اصول پر اس
رح عمل کرے کہ دوسروں کو اس کا علم ہو۔ اور اس کے
ے لئے عقلمندی کی بات بھی ہے کہ اگر لوگ اُسے کنجوس
یں تو اس کی کچھ پرواہ نہ کرے۔ اس لئے کہ ایسا وقت بھی
ئے گا کہ جب لوگ اُسے کشادہ دست بھی خیال کریں گے۔
اس وقت جب وہ دیکھیں گے کہ اپنی کفایت شعاری کی
ولت اُس کے پاس روپے کی کمی نہیں۔ اور وہ ہر اس
خص سے جو اُس پر حملہ آور ہو اپنی مدافعت کر سکتا ہے۔
ر اپنی رعایا پر بوجھ ڈالے بغیر مہم سر کر سکتا ہے۔ اور

اس طرح وہ ان سب کے ساتھ کشادہ دستی برت سکتا ہے۔ جن سے وہ کچھ وصول نہیں کرتا۔ اور جن کی تعداد بے شمار ہوتی ہے۔ رہی اس کی کنجوسی، سو اس کا اثر صرف ان پر پڑتا ہے جنہیں وہ کچھ نہیں دیتا اور جن کی تعداد بہت تھوڑی ہوتی ہے۔

ہمارے اپنے زمانے میں سوائے ان بادشاہوں کے جو کنجوس سمجھے جاتے اور کسی نے بڑے بڑے کام سرانجام نہیں دیئے۔ باقی جتنے تھے اُنہیں تباہی کا منہ دیکھنا پڑا۔ پوپ جولیس دوم نے پوپ بننے کے لئے تو ضرور اپنی کشادہ دستی کی شہرت سے کام لیا۔ لیکن بعد میں جب شاہ فرانس سے جنگ کی تو اس شہرت کو باقی رکھنے کی کوشش نہیں کی۔ جتنی لڑائیاں لڑیں اُن کے لئے اپنی رعایا پر ایک بھی نیا محصول نہیں لگایا۔ اور زائد اخراجات کو اس روپے سے پورا کیا جو ایک مدت تک کفایت شعاری برتنے سے اس کے پاس جمع ہوگیا تھا۔ اِسی طرح اگر موجودہ شاہ ہسپانیہ کشادہ دست ہوتا تو اتنی مہموں میں نہ تو وہ شریک ہوسکتا اور نہ اُن میں کامیابی حاصل کرسکتا۔

پس کنجوسی کا الزام لگتا ہے تو لگا کرے، اگر بادشاہ اس کی بدولت رعایا کو لوٹنے سے بے نیاز ہوجائے۔ اپنی

مدافعت کر سکے، افلاس اور حقارت سے اپنے آپ کو بچا سکے، اور لوٹ کھسوٹ کی اُسے ضرورت نہ رہے تو اسے اِلزام کی ذرا پرواہ نہ کرنی چاہیئے۔ اس لیئے کہ یہ ایسی خرابی ہے جس سے حکومت کرنے میں مدد ملتی ہے۔

اب اگر کوئی یہ اِعتراض کرے کہ سیزر نے اپنی کشادہ دستی کی بدولت حکومت حاصل کی اور اِسی طرح اور بہت سے لوگوں نے بڑے بڑے رُتبے اپنی کشادہ دستی اور اس کی شہرت سے حاصل کئے۔ تو میں یوں جواب دوں گا:" یا تو آپ پہلے سے بادشاہ ہیں۔ یا آپ بادشاہ بننا چاہتے ہیں۔ اگر بادشاہ ہیں تو کشادہ دستی میں نقصان ہوگا اور اگر دوسری صورت ہے تو ازبس ضروری کہ لوگ آپ کو کشادہ دست خیال کریں۔ سیزر اُن افراد میں سے تھا جو روما کی حکومت حاصل کرنا چاہتے تھے۔ لیکن اگر حکومت حاصل کرنے بعد اس نے اخراجات میں کمی نہ کی ہوتی تو سلطنت تباہ ہو جاتی:" اور اگر کوئی یہ کہے کہ بہت سے بادشاہوں نے جو کشادہ دست مشہور تھے اپنی فوجوں کے ذریعہ بڑی بڑی مہمیں سر کیں تو میرا جواب یہ ہوگا کہ بادشاہ جو کچھ خرچ کرتا ہے وہ یا تو اس کی اور اس کی رعایا کی مِلک ہوتی ہے یا دوسروں کی۔ پہلی صورت میں اُسے کفایت شعاری اختیار کرنی چاہیئے۔

لیکن دوسری صورت میں جتنا بھی خرچ کرے کم ہے۔ اس لیئے کہ جو بادشاہ اپنی فوج کا خود سپہ سالار ہو اور لوٹ مار کے ذریعہ اور زبردستی روپیہ وصول کر کے فوج کے اخراجات نکالے، تو چونکہ اس کے ہاتھ میں اوروں کی دولت آتی ہے۔ اس کے لیئے ضروری ہے کہ خوب خرچ کرے۔ خرچ نہ کرے گا تو اس کے سپاہی کاہے کو اُس کا ساتھ دینے لگے۔ غرض جو دولت بادشاہ یا اس کی رعایا کی ملکیت نہ ہو اُسے خوب اڑانا چاہیئے۔ جیسا سائرس، سیزر اور سکندر نے کیا۔ دوسروں کی دولت کو دل کھول کر خرچ کرنے سے شہرت میں کمی نہیں ہوتی، اضافہ ہوتا ہے۔ نقصان تب ہوتا ہے۔ جب اپنا روپیہ خرچ کیا جائے۔ کوئی خصلت کشادہ دستی سے زیادہ تباہ کن نہیں۔ جتنا اسے برتو گے اتنی حساب سے۔ روپیہ کم ہوتا جائے گا۔ افلاس ستانا شروع کرے گا۔ اور لوگوں کی نظر میں عزت باقی نہیں رہے گی۔ اور افلاس سے بچنا چاہو گے تو دوسروں پر زبردستی کرو گے اور لوگ نفرت کی نگاہ سے دیکھنے لگیں گے۔ ان دونتیجوں میں سے ایک یقینی ہے اور بادشاہ کو ان سے بچنے کے لیئے کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھنا چاہیئے۔ دانشمندی کا تقاضہ یہی ہے کہ کوئی کنجوس کہے تو کہا کرے، بدنامی سہی، نفرت تو نہ ہو گی۔ لیکن کشادہ دست مشہور رہنے کی خاطر مجبوراً لوٹ مار پر آمادہ ہونا۔ جس سے نفرت بھی پیدا ہو اور بدنامی بھی ہو بہت ہی برا ہے۔

# باب ۱۷

## سنگ دلی اور رحم دلی: کیا بہتر ہے
## لوگ محبّت کریں کہ ڈریں

اب بعض اور خصلتوں کو لیجئے جن کا ذکر اوپر آچکا ہے۔
میری رائے میں ہر بادشاہ کی یہ خواہش ہونی چاہئے چاہیے کہ
لوگ اُسے سنگ دل خیال نہ کریں بلکہ رحم دل سمجھیں۔ مگر
اس خصلت کے غلط استعمال سے اُسے بچنا چاہیئے۔ سیزارے
بورژیا سنگ دل مشہور رہتا۔ مگر یہ سنگ دلی ہی تو تھی کہ
روماناکو پھر سے اتحاد نصیب ہوا۔ وہاں امن وامان کا
دور دورہ ہوا۔ اور اس کی اطاعت کی گئی۔ پس اگر ہم چیزوں
کا صحیح جائزہ لیں گے۔ تو معلوم ہوگا کہ وہ اہلِ فلورنس
سے کہیں زیادہ رحم دل تھا۔ جنہوں نے سنگ دلی کے
الزام سے بچنے کی خاطر پستوجا کو فریق بندیوں سے

تباہ ہو جانے دیا[1]۔

پس بادشاہ کو سنگ دل مشہور ہونے کی پروا نہیں کرنا چاہئے۔ اگر اس سے وہ اپنی رعایا کو متحد اور مطیع و فرماں بردار رکھ سکے۔ جو کوئی دو ایک دفعہ سختیاں کرکے فتنہ و فساد کا خاتمہ کر سکے وہ آخرکار ایسے بادشاہ سے زیادہ رحم دل ثابت ہوگا جو نرمی کے خیال سے ڈھیل دیئے چلا جاتا ہے۔ اور جس کا نتیجہ لوٹ مار اور خون خرابا ہوتا ہے۔ ایسی نرمی سے پوری ریاست کو نقصان پہونچتا ہے۔ برخلاف اس کے سختیوں کا اثر صرف افراد پر پڑتا ہے۔

نئے بادشاہ کے لئے تو خاص طور پر اس بدنامی سے (کہ وہ سنگ دل ہے) بچنا ناممکن ہے۔ اس لئے کہ نئی ریاستیں خطروں میں گھری ہوئی ہوتی ہیں۔ چنانچہ ورجل دیدو کی زبان سے یوں اپنے حال کا اظہار کرتا ہے

ادھر ہے مہرباں قدر ... ادھر حکومت نئی نئی ہے
اسی لئے میرے حکمرانی کے یہ دستور [illegible]

---

[1] اہل فلورنس مختلف فرقوں کے سرداروں کو قتل کرنے سے ڈرتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۵۰۲ء میں بہت زیادہ گڑبڑ اور فسادات ہوئے۔ لوٹ مار کی کوئی حد نہ رہی اور ہزاروں جانیں ضائع ہوئیں۔

پھر بھی بادشاہ کو یہ سزاوار نہیں کہ کان کا کچا ہو یا آسانی سے کسی بات پر آمادہ ہو جایا کرے۔ اس کو یہ بھی نہ چاہئے کہ خطرہ کا اعلان کرنے میں پہل کرے۔ اس کا کام یہ ہے کہ دانشمندی کے دامن میں رحمدلی کا پیوند اس طرح لگائے کہ نہ تو دوسروں پر بہت زیادہ اعتماد کر لے سے آسے اپنی حفاظت کی فکر نہ رہے۔ اور نہ بلا وجہ اتنی بے اعتمادی ہی ٹھیک ہے کہ اپنے آپ کو ناقابل برداشت بنا دے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ بہتر کیا ہے۔ محبت کی نظر سے دیکھا جانا یا خوف کی نظر سے؟ صحیح جواب تو یہ ہے کہ دونوں یکجا ہوں تو کیا کہنے۔ مگر محبت اور خوف دونوں کا اس طرح یکجا ہونا قریب قریب ناممکن ہے۔ اور جب ان میں ایک کا انتخاب لازمی ہو تو یہ کہیں بہتر ہے کہ محبت کی بجائے لوگ ڈرتے رہیں۔ اس لئے کہ لوگ عام طور پر ناشکرگزار، متلون مزاج اور ناقابلِ اعتبار ہوتے ہیں۔ وہ خطرہ سے بچنے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں۔ اور نفع کی لالچ اُن میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے۔ جب تک آپ سے اُنہیں نفع پہونچتا رہے اس وقت تک آپ کا دم بھرتے ہیں۔ اور جب کوئی فوری ضرورت نہیں ہوتی، آپ کی خاطر خونریزی پر امادہ

ہو جاتے ہیں اور اپنی جائیداد اور اپنی جانیں اور اپنی اولاد کو قربان کرنے پر تیار نظر آتے ہیں۔ مگر جب واقعی ایسا کوئی موقع پیش آتا ہے تو آپ کے مخالف بن جاتے ہیں۔ پس جو بادشاہ اپنی حفاظت کا کوئی اور انتظام نہیں کرتا اور جس کا محض ان کے اظہار وفاداری پر دارومدار ہے اس کا خدا ہی حافظ ہے۔ اس لیئے کہ جو دوستی کسی قیمت پر خریدی گئی ہو اور جو اپنی عظمت اور اخلاقی بڑائی سے نہ حاصل کی گئی ہو اُس سے کام نہیں نکلا کرتا۔ اور ضرورت کے وقت وہ بالکل بیکار ثابت ہوا کرتی ہے۔ علاوہ ازیں اکثر لوگ ایسے بادشاہ کو خفا کرنے میں کم احتیاط سے کام لیتے ہیں جو اپنے آپ کو ہردلعزیز بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ بمقابلہ اس بادشاہ کے جو اپنا خوف لوگوں کے دلوں میں بٹھائے۔ بات یہ ہے کہ محبت کا بندھن ہے احسان شناسی اور انسان جو کہ عام طور پر بدی کی طرف مائل ہے، جہاں ذرا اپنی مفاد کا سوال آتا ہے وہ اسے پاش پاش کر دیتا ہے۔ مگر خوف کا تعلق ہے سزا کے ڈر سے اور یہ آسانی سے نہیں بھلایا جا سکتا۔

البتہ بادشاہ کو لوگوں کے دلوں میں اپنا خوف اس طرح پیدا کرنا چاہیئے کہ اگر ان کی محبت حاصل نہ ہو تو خیر مگر وہ اُن کی نفرت کا شکار نہ ہو۔ اس لئے کہ یہ ممکن ہے کہ لوگ

کسی شخص سے خائف ہوں اور اُس سے نفرت نہ کریں۔ اور
یہی صورت ہوگی اگر وہ اپنے شہریوں اور اپنی رعایا کی
جائدادوں اور اُن کی عورتوں پر دست اندازی نہیں
کرے گا۔ اور اگر وہ کسی کو موت کے گھاٹ اتارنے پر
مجبور ہو تو صرف اس صورت میں جب سبب ہر کوئی دیکھ
سکے۔ اور خاطر خواہ عذر موجود ہو۔ مگر خاص طور پر اُسے
دوسرے کی ملکیت سے اجتناب کرنا چاہئے۔ یوں کہ انسان
اپنے باپ کی موت تک بھول سکتا ہے۔ مگر اپنی ملک کا نقصان
اس سے نہیں بھلایا جاتا۔ پھر یہ کہ جائدادیں ضبط کرنے کے
بہانوں کی کبھی کمی نہیں ہوتی۔ اور جب ایک دفع دوسرے
کی ملک کا مزہ لگ جائے تو یہ سلسلہ پھر جاری رہتا ہے۔
بہ خلاف اس کے خون بہانے کے اسباب تعداد میں کم ہوتے
ہیں۔ اور نسبتاً جلد ختم ہو جاتے ہیں۔ لیکن جب کوئی بادشاہ
اپنی فوج کے ساتھ ہو اور اس کے ماتحت بہت سے سپاہی
ہوں تو اُسے سنگ دلی کے الزام کی ذرا نہ پرواہ کرنی
چاہئے۔ اس لئے کہ بغیر اس قسم کی شہرت کے کوئی سردار
اپنی فوج کو قابو میں نہیں رکھ سکتا اور اُسے خطرہ کے لئے
تیار نہیں کر سکتا۔ ہنیبال میں جہاں اور بہت سی ممتاز خصوصیات
تھیں۔ وہاں یہ بھی تھی کہ تو اس کی فوج بہت بڑی تھی اور

وہ مختلف اقوام کے لوگوں پر مشتمل تھی۔ پھر اسے جنگ کرنے کے لئے اسے ایک غیر ملک میں لایا گیا تھا۔ مگر تمام باتوں کے باوجود نہ تو اُن میں آپس میں کوئی مناقشہ ہوا۔ اور نہ انہوں نے کبھی اپنے سپہ سالار کے خلاف بغاوت کی۔ حالانکہ ہنیبال کو اچھے وقت سے بھی سابقہ پڑا اور برے وقت سے بھی۔ اس کا سبب سوائے سنگدلی کے اور کچھ نہ تھا۔ ہاں اس خصلت کے ساتھ ان گنت خوبیاں بھی تھیں۔ جن کی وجہ سے اس کے سپاہیوں کے دلوں میں اس کی بے انتہا عزت تھی۔ اور غیر معمولی دہشت۔ اور اگر وہ بے رحم مشہور نہ ہوتا تو محض دوسرے اوصاف سے اس طرح کے نتیجے برآمد نہ ہوتے۔ ناسمجھ مصنف اُس کے کارناموں کی تعریف میں تو رطب اللسان ہیں۔ مگر اُن کے اصل سبب کی بہت برائی کرتے ہیں۔ یہ بات کہ اُس کی دوسری خوبیاں بجائے خود کبھی اتنی موثر ثابت نہ ہوتیں۔ سیپیو کی مثال سے واضح ہو جاتی ہے۔ سیپیو نہ صرف اپنے زمانے بلکہ دنیا کی تمام تاریخ کے عظیم ترین سپہ سالاروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ ہسپانیہ میں اُس کی فوجوں نے اس سے بغاوت کی لیے وجہ صرف اتنی تھی

ملہ واقعہ ہے ۲۰۶ ق۔ م کا۔

کہ اس نے ان کے ساتھ بہت زیادہ نرمی کا برتاؤ کیا۔ اور انہیں وہ آزادیاں دیں جو فوجی ضابطے کے برخلاف تھیں۔ یہی وہ الزام تھا۔ جو فابیس ماکسی مس نے سینیٹ کی مجلس میں اس پر لگایا۔ اور اسے روما کی سپاہ کو خراب کرنے والے کا لقب دیا۔

اسی طرح جب لوچری کے باشندوں پر اس کے ایک نائب[1] نے نہایت ہی شرمناک مظالم ڈھائے۔ تو اس نے نہ تو کوئی بازپرس کی اور نہ اپنے نائب کو اس کی زیادتی کی سزا دی۔ سبب وہی تھا، یعنی اس کی طبیعت کی لاپرواہی۔ اسی پر کسی نے جو اس کی طرف سے وکالت کرتے ہوئے سینیٹ میں کہا کہ ایسے افراد کی تعداد بہت بڑی ہے جو خود غلطی کا ارتکاب کرنے سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنا جانتے ہیں۔ مگر یہ نہیں جانتے کہ دوسروں کو غلطی کرنے سے کیونکر روکیں۔ اگر سیپیو کی طبیعت کا انداز یہی رہتا اور فوج کی کمان اس کے ہاتھ میں رہتی تو آگے چل کر ضرور اس کی شہرت اور ناموری

[1] مراد ہے پلے مینیس جس نے اس شہر کو بری طرح لوٹا، حالانکہ اس کے ذمہ کا رتیجیوں سے اس کی حفاظت تھی۔ اس نے بہت سے معزز لوگوں کو قتل کروا دیا۔

کوبھی بٹہ لگتا۔ مگر وہ تو سینیٹ کے ماتحت تھا۔ اور اس وجہ سے اس نقصان دہ خصلت پر نہ صرف پردہ پڑا رہا بلکہ اس کو عزت کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا۔

آخر میں اس سوال کے جواب میں "محبت بہتر ہے یا دہشت؟" میں بطور خلاصہ کے بس اتنا کہوں گا کہ بادشاہ سے محبت کا دارومدار ہے رعایا پر۔ اور دہشت کا دارومدار ہے خود اس پر۔ تو عقلمند بادشاہ کو ان بنیادوں پر عمارت کھڑی کرنی چاہئے جو اس کے اختیار میں ہوں۔ نہ ان پر جن پر دوسروں کا اختیار ہو۔ البتہ نفرت سے بچنے کے لیئے اسے ہر ممکن کوشش کرنی چاہئے۔

# باب ۱۸

## بادشاہتیں اور وفائی عہد

ہر شخص کو اس سے اتفاق ہوگا کہ بادشاہ کے لیے عہد و پیمان پر قائم رہنا، راستبازی اختیار کرنا اور دغا و فریب سے کنارہ کشی اختیار کرنا بہت ہی قابل تعریف بات ہے۔ مگر ہمارے زمانے میں جو واقعات پیش آئے ہیں اُن میں خود ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ ایسے بادشاہوں نے جنہوں نے عہد و پیمان کی کبھی پرواہ نہ کی اور دوسروں کو دھوکے اور فریب سے نیچا دکھایا۔ بڑے بڑے کارہائے نمایاں کئے ہیں۔ اور وہ اُن بادشاہوں سے کہیں بہتر رہے جنہوں نے راستبازی کو اپنا شعار بنایا۔ پس معلوم ہونا چاہئیے کہ مقابلہ دو طرح ممکن ہے، بزورِ قانون یا بزورِ بازو۔ ان میں سے پہلا طریقہ انسانوں کے لئے اور دوسرا طریقہ حیوانوں کے

لیئے موزوں ہے۔ مگر دقت یہ ہے کہ پہلا طریقہ اکثر ناکام
ثابت ہوتا ہے۔ اور دوسرے طریقہ کو اختیار کرنے پر
انسان مجبور رہوتا ہے۔ اس لئے بادشاہ کو دونوں
طریقوں کا معقول استعمال جاننا چاہئے۔ یہ سبق قدیم
مصنفوں نے پوشیدہ طور پر ہمیں سکھایا ہے۔ وہ ہمیں
بتاتے ہیں کہ اچی لیز اور قدیم بادشاہوں میں سے اور
بھی بہت سارے کس طرح تربیت کے لیئے اسپادم[1]
چیرن کے حوالہ کر دیئے گئے تھے۔

ایسا استاد رکھنے کے جو نصف انسان ہو اور
نصف حیوان۔ بس ایک ہی معنی ہو سکتے ہیں۔ وہ یہ کہ
بادشاہ کے لئے دونوں خصلتیں ضروری ہیں۔ اور
یہ کہ ایک کو دوسرے کے بغیر استقلال ممکن نہیں۔

مگر چونکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ بادشاہ حیوانی صفات کا
استعمال عقلمندی کے ساتھ کرے۔ اسے نمونہ کے طور پر شیر
و روباہ دونوں کو اپنے سامنے رکھنا چاہئے۔ اس لئے کہ شیر
اپنے آپ کو جال سے نہیں بچا سکتا اور لومڑی بھیڑیوں سے

---

[1] اسپادم ترجمہ ہے Centaur کا۔ جو یونانی
خیال کے مطابق ایک خیالی جاندار ہے اور نصف اسپ اور
نصف انسان سمجھا جاتا ہے۔

مقابلہ میں لاچار ہوتی ہے۔ چنانچہ جال کا پتہ لگانے کے لئے لومڑی اور بھیڑیوں کو بھگانے کے لئے شیر بننے کی ضرورت ہے۔

محض شیری پر بھروسہ کرنا کوئی دانائی کی بات نہیں۔ چنانچہ بادشاہ کے لئے نہ تو یہ ممکن ہے اور نہ اسے اس بات کی ضرورت کہ وہ اپنے عہد و پیمان پر اس صورت میں بھی قایم رہے جب ایسا کرنے سے اسے نقصان پہونچتا ہو اور عہد و پیمان کرنے کے جو اسباب تھے وہ باقی نہ رہے ہوں۔ سب انسان نیک ہوتے تو یہ مشورہ غیر مناسب ہوتا۔ مگر لوگ تو اکثر بے ایمان ہوتے ہیں۔ وہ اپنی بات پر قائم نہیں رہتے۔ تو بادشاہ کیوں اتنی سختی کے ساتھ عہد کی پابندی کرے۔ عہد توڑنا ہو تو بادشاہ ہزار بہانے تلاش کر سکتا ہے۔ زمانہ حال میں اس قسم کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔ کتنے عہد نامے اور قول و قرار تھے جن کو بادشاہوں نے توڑا اور اس وجہ سے وہ بے کار اور بے معنی ثابت ہوئے۔ بادشاہ لومڑی کی طرح چالاک ہو تو کامیابی اس کے قدم چومے گی۔

البتہ یہ ضروری ہے کہ اس صفت کو اچھے رنگ میں پیش کیا جائے۔ اور بناوٹ اور حیلہ سازی میں خاص مہارت پیدا کی جائے۔ لوگ اس قدر بھولے ہوتے ہیں اور فوری

ضروریات سے اتنے متاثر کہ اگر کوئی انھیں دھوکا دینے کی دل میں ٹھان لے تو اسے دھوکا کھانے والوں کی کبھی کمی شکایت نہ ہونے پائے گی۔ زمانۂ حالی کی ایک مثال خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ پوپ الگزانڈر کا بس ایک ہی خیال تھا اور ایک ہی دھن۔ وہ یہ کہ کس طرح دوسروں کو دھوکا دے۔ اور تختۂ مشق بننے کو اسے ہمیشہ کوئی نہ کوئی ملتا رہا۔ اس سے پہلے شاید ہی کبھی کوئی شخص گذرا ہو جو اتنی شدت کے ساتھ بڑے بڑے دعوے کرے اور ایمان کا حوالہ دے دے کر قول وقرار کرے گو وعدے وفا کرنے کا ذرا بھی ارادہ نہ ہو۔ مگر باوجود ان تمام باتوں کے، چونکہ وہ انسانی فطرت کی اس کمزوری کو خوب سمجھتا تھا۔ دغا و فریب میں اُسے ہمیشہ کامیابی ہوتی رہی۔

یہ ضروری نہیں کہ بادشاہ میں وہ سب خصائل جمع ہوں جو میں نے اوپر گنائے ہیں۔ مگر ظاہر طور پر ایسا معلوم ضرور ہونا چاہئے کہ وہ سب اس میں موجود ہیں۔ یہی نہیں میں تو یہ تک کہنے کو تیار ہوں کہ بادشاہ میں یہ سب خصائل واقعی جمع ہونے اور اس کے عمل میں ہمیشہ ان کا اظہار ہونے سے نقصان کا ڈر ہے۔ لیکن اگر صرف ظاہر میں ایسا دکھلائی دے تب البتہ مفید ہوگا۔ چنانچہ یہ اچھی بات ہے کہ بادشاہ

رحمدل، دیانتدار، حلیم، دیندار اور راستباز معلوم ہو اور واقعی ہو بھی، مگر اس کا مزاج کچھ ایسا ہونا چاہئے کہ اگر کسی موقع پر ان اوصاف سے بات بنتی نظر نہ آئے تو مخالف خصائل سے کام نکالے۔

یہ بھی آپ اچھی طرح ذہن نشین کر لیں کہ بادشاہ اور خاص طور پر نیا بادشاہ ان تمام اصولوں پر عمل پیرا نہیں ہو سکتا جو انسان کو نیک خصلت سمجھ کر وضع کیے گئے ہیں۔ اپنی بادشاہت برقرار رکھنے کے لئے وہ اکثر مجبور ہو جاتا ہے کہ ایفائے عہد نیکوکاری، بھلمنسی اور دینداری کو خیرباد کہے۔ اس لیے اپنے رویہ میں تبدیلی کے لئے اسے ہمیشہ تیار رہنا چاہئے قسمت پلٹا کھائے تو وہ بھی اپنا رخ بدل دے۔ البتہ جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں جب تک ممکن ہو نیکی کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑے، مگر جب اسے ترک کرنا ضروری ہو تو یہ بھی بیباکی کے ساتھ کرے۔

پس بادشاہ کو چاہئے کہ وہ کبھی ایسی بات زبان پر نہ لائے جس میں متذکرہ بالا پانچ خوبیاں موجود نہ ہوں، تاکہ جو کوئی اس سے ملے اور اس کی گفتگو سنے تو یہ سمجھے کہ وہ رحم دیانتداری، راستبازی، کرم اور دینداری کا مجسمہ ہے۔ اور ان سب اوصاف میں آخری وصف کا نظر آنا خاص

طور پر ضروری ہے۔ بات یہ ہے کہ عام طور پر لوگ آنکھ سے
دیکھ کر رائے قایم کرتے ہیں، برت کر نہیں۔ اس لئے کہ دیکھ
تو سب سکتے ہیں، مگر برتنے کا موقع شاذونادر کسی کو ملتا ہے ظاہر
میں انسان جیسا نظر آتا ہے وہ ہر ایک دیکھتا ہے، مگر وہ دراصل
جیسا ہے اس کا پتہ بہت کم لوگوں کو چل پاتا ہے۔ اور گنتی کے
یہ چند لوگ اس بڑی جماعت کی مخالفت نہیں کر سکتے جن کی
پشت پر ریاست کی تمام طاقت و جبروت ہو۔ پھر یہ بھی ہے کہ
تمام افراد خاص طور پر بادشاہوں کے افعال کے متعلق
جن کے بارے مین کسی عدالت سے اپیل نہیں کی جا سکتی
بس نتیجوں ہی کی بنا پر رائے قایم کی جا سکتی ہے۔
یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی بادشاہ[1] اپنی حکومت قایم کر کے
اسے برقرار رکھ سکے تو پھر ذرایع ٹھیک ہی خیال کئے
جائیں گے اور ہر شخص اس کی تعریف میں رطب اللسان
ہوگا۔ اس لئے کہ عوام ظاہرا صورت پر جاتے ہیں اور
نتایج سے مرعوب ہوتے ہیں۔ اور دنیا عوام کی ٹھہری۔
اقلیت کو دنیا میں صرف اس وقت کامیابی ہوتی ہے جب
اکثریت اپنی رائے پر قایم نہیں رہتی۔
موجودہ زمانہ کا ایک بادشاہ[1] جس کا نام لینا مناسب

---

[1] مراد ہے فرڈیننڈ شاہ اسپانیہ۔

نہیں معلوم ہوتا ہمیشہ صلح اور ایفائے عہد کا راگ الاپا کرتا ہے
حالانکہ ان دونوں سے اسے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ اور
اگر ان میں سے ایک پر بھی اس کا عمل ہوتا تو اس کی شہرت
اور تخت و تاج کبھی کے خاک میں مل چکے ہوتے۔

# باب ۱۹

## اپنے آپ کو حقارت اور نفرت سے بچانے کے بیان میں

اوپر جن خصلتوں کا ذکر ہوا ان میں سے جو خاص طور پر اہم تھیں ان پر تو میں بحث کر چکا ہوں۔ اب باقیماندہ صفات پر ایک سرسری نظر ڈالتا ہوں۔ جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں بادشاہ کو ان باتوں سے خاص طور پر اجتناب کرنا چاہیئے جن سے اس کے خلاف نفرت پیدا ہوتی ہو یا جن سے وہ لوگوں کی نظروں میں ذلیل و خوار ہوتا ہو۔ اس میں اسے جتنی کامیابی ہوگی اتنا ہی وہ سرخرو ہوگا اور پھر اور اعتراضات کا کوئی خوف نہ ہوگا۔

بادشاہ کے خلاف جن چیزوں سے سب سے زیادہ نفرت پیدا ہوتی ہے وہ یہ ہیں۔ حرص۔ دوسروں کی ملکیت پر قبضہ جمانا، رعایا میں سے عورتوں پر دست درازی کرنا۔ ان سے بچنا اشد ضروری ہے۔ جب تک ان کی جائدادیں

اور آبرو سلامت رہتی ہیں۔ اگر لوگ مطمئن رہتے ہیں اور بادشاہ سے مقابلہ کرسکتے ہیں تو کسی کے چند ہمنشیں اور اور بعض دوسرے آسانی سے کچل سکتا ہو۔

بادشاہ کو لوگوں کی نظروں میں حقیر کرنے والی باتیں ہیں۔ تلون، چھچھورا پن، نسوانیت، بزدلی اور تذبذب۔ بادشاہ کا ان برائیوں سے دور کا بھی واسطہ نہ ہونا چاہیے۔ اس کی کوشش ہمیشہ یہ رہنی چاہیئے کہ اس کے تمام کاموں میں عظمت، عالی ہمتی، دانشمندی اور طاقت کا اظہار ہو۔ رعایا کے ساتھ نجی تعلقات میں اس کے فیصلے اٹل ہونے چاہئیں اور اس کی ایسی شہرت ہونی چاہیے کسی کو اسے جھانسا دینے کا کبھی گمان تک نہ گذرے۔

جو بادشاہ اپنے بارے میں ایسی رائے پھیلانے میں کامیاب ہو جاتا ہے اس کی بڑی عزت ہوتی ہے اور جس کی بہت عزت ہو اس کے خلاف سازش بہت مشکل ہے اسی طرح جب کسی کو غیر معمولی طور پر اچھا بادشاہ سمجھا جائے اور رعایا دل سے اس کی عزت کرے تو اس پر حملہ کرنا آسان نہیں۔ اس لئے کہ بادشاہ کو دو طرح کا خطرہ ہو سکتا ہے، ایک اندرونی یعنی اپنی رعایا کی طرف سے دوسرا بیرونی یعنی دوسری ریاستوں کی جانب سے۔ دوسری

ریاستوں سے اپنی محافظت اچھے ہتھیاروں اور اچھے حلیفوں کی مدد سے ممکن ہے۔ اور بادشاہ کے پاس اسلحہ اچھے ہوں گے تو حلیف بھی اچھے ملتے رہیں گے۔ اور جب بیرونی خطرہ نہ ہوگا تو ریاست کے اندر بھی امن وامان رہے گا۔ سوائے اس صورت کے سازشیوں کے سکون میں خلل پڑ جائے۔ پھر یہ کہ بیرونی حملہ بھی ہو تو مضائقہ نہیں۔ اگر بادشاہ کی تیاریاں سب مکمل ہوں اور اس کی حکمت عملی وہ ہو جس کا میں نے اوپر مشورہ دیا ہے تو اگر وہ خود ہی نہ چھوڑ بیٹھے تو ہر حملہ کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ کر سکے گا۔ ٹھیک اسی طرح جیسا کہ نابس شاہ اسپارٹا نے کیا۔ بیرونی خوف نہ ہو تو ایک خطرہ باقی رہ جاتا ہے۔ یعنی رعایا میں سازشوں کا امکان ان سے بھی بادشاہ اپنے آپ کو آسانی سے محفوظ رکھ سکتا ہے بشرطیکہ وہ لوگوں میں اپنے خلاف نفرت اور حقارت کا جذبہ نہ پیدا ہونے دے اور قوم کو ہر طرح خوش رکھے۔ جیسا کہ پہلے تفصیل کے ساتھ بیان کر چکا ہوں یہ باتیں بہت ہی ضروری ہیں۔ اپنے خلاف سازشوں کا سب سے موثر علاج یہی ہے کہ قوم کو بادشاہ سے نفرت نہ ہو اور وہ اسے حقارت کی نظر سے نہ دیکھے۔ اس لئے کہ جو کوئی بادشاہ کے

خلاف سازش کرتا ہے وہ ہمیشہ اس توقع کے ساتھ کہ بادشاہ کے ہٹنے سے قوم کو خوشی ہوگی. لیکن جب سازشی کو یہ پتہ چلے کہ اس بات سے قوم ناراض ہوگی تو اس کی ہمت پست ہوجائے گی اور وہ اپنی اس حرکت سے باز آئے گا اس لئے کہ سازشی کی راہ میں ہزار دقتیں ہوتی ہیں۔ تجربہ بھی شاہد ہے کہ سازشیں کتنی بھی زیادہ ہوں، کامیابی شاذونادر ہوتی ہے۔ بات یہ ہے کہ سازشی تن تنہا تو کچھ کر نہیں سکتا اور اپنا شریک وہ انھیں کو بنا سکتا ہے جو اس کے خیال میں بادشاہ سے بیزار ہوں۔ اور جہاں اس قسم کے لوگوں سے اس نے اپنے دل کی بات کہی اور انھیں اپنی شکایتوں کے دور کرنے کا سامان ہاتھ آیا۔ یہ لوگ بھانڈا پھوڑ دیتے ہیں اس لئے کہ ایسا کرنے سے ان کے ہزار فائدے ہوتے ہیں۔ چنانچہ جب ایک راستہ اختیار کرنے میں فائدہ ہی فائدہ ہو اور دوسرا طریق مشتبہ اور پرخطر ہو، تو سازشی کا ساتھ دینا یا تو اس کے بہت ہی غیر معمولی دوست کا کام ہو سکتا ہے یا بادشاہ کے جانی دشمن کا۔

اس مسئلہ کو چند الفاظ میں یوں بیان کیا جاسکتا ہے کہ سازشی کی جانب سوائے خوف، بدظنی اور سزا کے امکان کے

اور کچھ نہیں ہوتا اور بادشاہ کی جانب بادشاہت کی شان وشوکت، قوانین، دستور کی حمایت اور ریاست کی پشت پناہی۔ غرض کیا کچھ نہیں ہوتا۔ ان میں قوم کی خیرخواہی کا اضافہ کیجئے۔ پھر کون ایسا ناعاقبت اندیش ہوگا کہ سازش کرنے کا ارادہ کرے۔ اس لئے کہ سازش کی بجاآوری سے پہلے تو سازشی کو عام طور پر خوف رہتا ہی ہے مگر اس صورت میں جرم کرنے کے بعد بھی وہ خوف میں مبتلا رہتا ہے، یوں کہ وہ قوم کی دشمنی مول لے لیتا ہے اور اس کے لئے نجات کی کوئی امید باقی نہیں رہتی۔

اس موضوع سے متعلق کتنی ہی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ مگر میں ایک ہی پر اکتفا کرتا ہوں۔ یہ مثال ہمارے اپنے آبا کے زمانہ کی ہے۔ ہنی بال بنتی وولی (یعنی موجودہ ہنی بال کا دادا) جو بلونا کا بادشاہ تھا جب کنیشی سازشیوں کے ہاتھوں قتل ہوا[1] تو سوائے مسٹر ژیووانی کے جو اس وقت بہت کمسن تھا شاہی خاندان میں سے ایک فرد بھی باقی نہ رہا۔ مگر بادشاہ کے قتل کے بعد فوراً ہی قوم اٹھی اور اس نے تمام کے تمام کنیشی سازشیوں کو ملیا میٹ کر دیا۔ وجہ یہ تھی کہ اس زمانہ میں بلونا کے

---

[1] ۲۴ جون ۱۴۴۵ء کا واقعہ ہے۔

لوگ اس شاہی خاندان سے بہت خوش تھے۔ وہ اس کو
اس درجہ محبوب رکھتے تھے کہ گوہنی بال کی موت کے بعد
اس کے خاندان میں کوئی اور شخص ریاست پر حکمرانی کے
قابل نہ رہا تاہم جب اہل بلونا کو یہ پتہ چلا کہ جنتی وولی
خاندان کا ایک رکن فلورنس میں موجود ہے جو اس وقت
تک کسی لوہار کا لڑکا خیال کیا جاتا تھا تو اسے وہاں سے
بلوایا اور اپنے شہر کی حکومت اسے سونپی اور مسر ژیووانی
کے سن بلوغ کو پہونچنے تک اس نے وہاں حکومت کی[1]

اسی وجہ سے میں سمجھتا ہوں کہ قوم میں بادشاہ کی
عزت ہو تو اسے سازشوں کی پرواہ نہ کرنی چاہیئے۔ ہاں
قوم مخالف ہو اور بادشاہ سے نفرت کرتی ہو تو پھر ہر
بات اور ہر ایک سے ڈرنا ضروری ہے۔ اچھی منظم ریاستیں
اور عقلمند بادشاہ ہمیشہ اس بات کا خاص خیال رکھتے
ہیں کہ شرفا ان سے بالکل مایوس نہ ہونے پائیں اور
اور قوم بھی مطمئن اور خوش رہے۔ بادشاہ کے مقاصد
میں اس کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔

ہمارے زمانہ میں جن ریاستوں کا رکھ رکھاؤ
اور نظام حکومت سب سے بہتر ہے ان میں فرانس بھی

---

[1] سنہ ۱۴۴۵ تا سنہ ۱۴۶۲ء

ہے۔ فرانس میں بہت سے ایسے معقول ادارے ہیں جن پر بادشاہ کی خود مختاری اور سلامتی کا دارومدار رہے۔ ان میں اولین پارلیمنٹ اور اس کا اختیار ہے۔ اس لئے کہ جس کسی نے فرانس کا دستور بنایا وہ اگر ایک طرف شرفا کی جاہ طلبی اور دیدہ دلیری سے بخوبی واقف تھا تو دوسری طرف اسے اس نفرت کا اچھی طرح اندازہ تھا جو خوف کی بنا پر عوام کو شرفا کے ساتھ تھی۔ اس کی خواہش تھی کہ عوام کو شرفا کی طرف سے کوئی خطرہ نہ رہے۔ مگر ان کی حفاظت کی ذمہ داری وہ بادشاہ کے کاندھوں پر ڈالنے پر آمادہ نہ تھا۔ عوام کی طرفداری کرنے سے شرفا میں اور شرفا پر لطف وکرم کرنے سے عوام میں جو بدظنی پیدا ہوتی اس کی ذمہ داری وہ اپنے اوپر سے ہٹانا چاہتا تھا۔ اس غرض سے وہ ایک غیر جانبدار ادارہ وجود میں لایا تاکہ بادشاہ کو پابند کئے بغیر شرفا کو دبایا جا سکے اور عوام کی حمایت کی جا سکے۔ اس سے بہتر اور عقلمندانہ تدبیر اور بادشاہ کے بچاؤ کی اس سے زیادہ کارگر صورت ممکن نہ تھی۔ ہم اس مثال سے ایک اور اہم سبق بھی حاصل کر سکتے ہیں۔

---

[۱] مراد سے وہ الگ صالتیں مالیہ سے جو مختلف صوبوں میں خلیپ دوم (۱۱۸۰ء تا ۱۲۲۳ء) کے عہد میں عالم وجود میں آئیں۔

یعنی بادشاہ کو چاہئے کہ جن معاملات میں ملامت کا ڈر ہو وہ دوسروں کے سپرد کرے اور لطف و انعام کا منبع اپنی ذات کو بنائے۔ میں پھر اس بات پر زور دوں گا کہ بادشاہ کو شرفا کی عزت کرنی چاہئے مگر اس کے ساتھ ہی اپنے آپ کو عوام کی نفرت و ملامت کا نشانہ نہ بننے دینا چاہئے۔

شاید بعض لوگ یہ سمجھتے ہوں کہ روما کے شہنشاہوں کی حیات و ممات کا بغور مطالعہ کرنے سے اس قسم کی مثالیں ملتی ہیں جن سے میرے نظریئے کی تردید ہوتی ہے۔ اس لئے کہ ان میں سے بہت سے ایسے تھے۔ جن کی تمام زندگی نیکیاں ہی نیکیاں کرتے گذری مگر پھر بھی انہیں تخت سے دست بردار ہونا پڑا اور سازشی رعایا کے ہاتھوں انہیں موت کا منہ بھی دیکھنا پڑا۔

ان اعتراضات کا جواب دینے کے لئے میں کئی شہنشاہوں کی سیرت کی جانچ پڑتال کر کے یہ ثابت کروں گا کہ ان کے زوال کے اسباب میرے بتائے ہوئے اسباب سے ذرا بھی مختلف نہ تھے اس سلسلہ میں صرف چند ایسے واقعات کو منتخب کروں گا۔ جن پر ہر اس شخص کی نظر پڑنا لازمی ہے جو اس زمانہ کی تاریخ کا مطالعہ کرے۔ اور میرا مقصد حاصل ہو جائے گا۔ اگر میں

ان شہنشاہوں کو منتخب کروں جنہوں نے مارکس[1] مسنی کے زمانہ سے لے کر ماکسی مینس[10] کے زمانہ تک حکومت کی۔

نام یہ ہیں:-

مارکس۔ اس کے بعد اس کا بیٹا کومڈس[2]، پھر پرتی ناکس[3]، جولیانس[4]، زیویرس[5] اور اس کا بیٹا انتونی نس کراکلا[6]، مکرینس[7]، ہیلیوگابلس[8]، الگزانڈر[9] اور مکسی مینس۔

یاد رکھنے کے لایق بات یہ ہے کہ اور بادشاہتوں میں تو بس شرفا کی جاہ طلبی اور عوام الناس کی خیرہ سری سے مقابلہ ہوتا ہے مگر شہنشاہان روما کے لئے ایک اور دشواری بھی تھی۔ انہیں اپنی سپاہ کے مظالم اور طمع کو پیش نظر رکھنا ہوتا تھا۔ اس سے طرح طرح کی دقتیں پیدا ہوتی تھیں۔ یہاں تک کہ بہت سے شہنشاہوں کی تباہی کا یہی سبب ہوا۔ اس لیے کہ یہ تقریباً ناممکن تھا کہ وہ فوج اور عوام الناس دونوں کو خوش رکھ سکیں۔

---

[1] سنہ ۱۶۱ء تا سنہ ۱۸۰ء

[2] سنہ ۱۸۰ء تا سنہ ۱۹۲ء

[3] سنہ ۱۹۲ء تا سنہ ۱۹۳ء

[4] سنہ ۱۹۳ء

[5] سنہ ۱۹۳ء تا سنہ ۲۱۱ء

[6] سنہ ۲۱۱ء تا سنہ ۲۱۷ء

[7] سنہ ۲۱۷ء تا سنہ ۲۱۸ء

[8] سنہ ۲۱۸ء تا سنہ ۲۲۲ء

[9] سنہ ۲۲۲ء تا سنہ ۲۳۵ء

[10] سنہ ۲۳۵ء تا سنہ ۲۳۸ء

عوام امن و امان کے دلدادہ تھے اور اس وجہ سے وہ نرم مزاج بادشاہوں کو ترجیح دیتے تھے۔ مگر فوج کو جنگ جو بادشاہ مرغوب تھے چاہے وہ کتنے ہی بے رحم، متکبر اور غارت گر کیوں نہ ہوں۔ فوج تو یہی چاہتی تھی کہ بادشاہ ان خصائل کا استعمال جی کھول کر قوم کے خلاف کرتا رہے تاکہ سپاہیوں کو دوگنی چوگنی تنخواہیں اور لوٹ مار کا موقع مل سکے۔ یہی وجہ تھی کہ ایسے شہنشاہ ہمیشہ تباہ و برباد ہوتے رہے جن میں پیدائشی طور پر یا تربیت کی بدولت یہ صلاحیت پیدا نہ ہو پائی کہ فوج اور عوام الناس دونوں کو قابو میں رکھ سکتے۔ ان میں سے اکثر کا اور خاص طور پر ان کا جنہیں نئی نئی بادشاہتیں مل جاتی تھیں یہ طریقہ رہا کہ جب اُس تضاد کی وجہ سے انہیں دقتوں کا سامنا ہوا تو انہوں نے فوج کو خوش کرنے کی ٹھانی اور قوم کو اس سے جو نقصان پہونچا اس کی ذرا پرواہ نہ کی۔ ان کے لئے یہ راہ اختیار کرنا تھا بھی ضروری۔ یوں کہ یہ تو ممکن نہیں کہ کوئی بھی بادشاہ سے نفرت نہ کرے۔ البتہ بادشاہوں کو ایسی تدبیر کرنی چاہئے کہ رعایا میں سے کوئی مستقل جماعت ان سے نفرت نہ کرنے لگے۔ اور اس میں ناکامی ہو تو پھر انہیں نسبتاً زیادہ طاقتور جماعت کی نفرت سے اپنے

آپ کو محفوظ رکھنے کی ہر ممکن تدبیر کرنی چاہئے۔ چنانچہ روما میں جو شہنشاہ نئے نئے حکمراں بنے تھے اور اس وجہ سے خاص طور پر حمایت کے محتاج تھے انھوں نے قوم کے مقابلہ میں فوج کا ساتھ دیا۔ اس پالیسی سے کبھی فائدہ ہوا اور کبھی نقصان۔ بادشاہ اپنا اقتدار جما سکا تو فائدہ میں رہا نہیں تو نقصان میں۔

یہی سبب تھا کہ مارکس پرتی ناکس اور الکزانڈر جو نرم مزاج، انصاف دوست، ظلم و تعدی کے دشمن، خلیق اور رحم دل تھے ان میں سے مارکس کے علاوہ باقی دونوں کا انجام نامبارک ہوا۔ البتہ نہ صرف زندگی میں بلکہ موت کے بعد بھی مارکس کی بڑی عزت ہوئی۔ وجہ یہ تھی کہ اُسے شہنشاہیت ورثہ میں ملی تھی۔ فوج یا قوم کی مہربانی سے حاصل نہ ہوئی تھی۔ پھر وہ بہت سی خوبیوں کا مالک بھی تھا جن کی بنا پر اس کا بہت زیادہ احترام ہوتا تھا اور اس وجہ سے دونوں فریقوں کو حدود کے اندر رکھنے میں اسے کامیابی نصیب ہوئی اور خود نفرت و حقارت کا شکار نہ ہوا۔

مگر پرتی ناکس فوج کی مرضی کے خلاف شہنشاہ منتخب ہوا تھا۔ اس سے پہلے کموڈس کے ماتحت فوج بالکل

بے لگام رہ چکی تھی۔ وہ کس طرح آسانی سے ضابطہ کی زندگی اختیار کرتی، اور کمودس کے جانشین کی یہی کوشش تھی۔ قوم اسے نفرت کی نگاہ سے دیکھتی تھی اور اس کے بڑھاپے کی وجہ سے قوم پر اس کا کوئی رعب نہ تھا۔ چنانچہ اس کی حکومت شروع ہی ہوئی تھی کہ تباہی آن پہونچی۔

یہاں پر یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ نفرت صرف برے کاموں ہی کے سبب پیدا نہیں ہوا کرتی اچھے کاموں کی وجہ سے بھی ہو جاتی ہے۔ اسی وجہ سے تو میں نے پہلے کہا ہے کہ حکومت قایم رکھنے کے لئے بادشاہ کو اکثر نیکی کا ساتھ چھوڑ کر برائی اختیار کرنی پڑتی ہے۔ جب وہ جماعت بد اطوار ہو جس کی امداد پر بات کا دارومدار رہے چاہے وہ جماعت عوام پر چاہے فوج اور چاہے شرفا پر مشتمل ہو تو ضروری ہے کہ بادشاہ اس جماعت کے ساتھ نباہ کی صورت پیدا کرے اور اس کی ہر طرح تشفی کرے۔ ایسی صورت میں نیکی سے کام نہ چلے گا۔

اب الکزانڈر کو لیجئے وہ اس قدر انصاف پسند تھا کہ اس کی مدح وثنا کے سلسلہ میں بیان کیا جاتا ہے کہ گو وہ چودہ برس اس عہدۂ جلیلہ پر فائز رہا نہ بغیر قانونی کارروائی کے

ایک شخص بھی جان سے نہ مارا گیا۔ تاہم چونکہ لوگ اسے زنخا سمجھتے تھے اور یہ خیال کرتے تھے کہ وہ اپنی ماں کے اشارہ پر چلتا ہے۔ اس لیئے وہ لوگوں کی نظر میں بہت حقیر ہوگیا۔ اور فوج نے سازش کرکے اسے قتل کر ڈالا۔

اب اگر کموڈس، زیویرس، کراکلا اور رکسی مینس پر ہم نظر ڈالتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ وہ سب کے سب نہایت ہی ظالم اور غارتگر شہنشاہ تھے۔ اپنی فوج کو خوش کرنے کی خاطر قوم پر کسی طرح کا بھی ظلم کرنے سے انھیں ذرا عار نہ تھا۔ سوائے زیویرس کے ان سب کا انجام برا ہوا۔ البتہ زیویرس میں کچھ ایسی خوبیاں تھیں کہ قوم پر اس نے طرح طرح کے مظالم توڑے مگر فوج سے دوستی پیدا کرکے وہ اخیر تک بہت کامیابی کے ساتھ حکومت کرتا رہا۔ اس میں بعض ایسے اعلیٰ اوصاف پائے جاتے تھے کہ کیا قوم اور کیا سپاہ سب ہی اس کے ثنا خواں تھے۔ اس کا کچھ ایسا رعب تھا کہ ایک طرف قوم کی آنکھیں چکا چوند ہوگئیں اور دوسری طرف فوج حد درجہ موودب اور خاموش نظر آنے لگی۔ اس اعتبار سے کہ اسے بادشاہت نئی نئی ملی تھی اس کے کارنامے نہایت عظیم الشان تھے۔ میں ابھی یہ مختصر طور پر بتاؤں گا کہ وہ کتنی کامیابی کے ساتھ شیر و روباہ

دونوں کا پارٹ کر سکتا تھا اور جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں بادشاہ کو ان دونوں صفات کا مالک ہونا چاہیئے۔

زیویرس کو شہنشاہ جولین کے نکمے پن کا پتہ تھا۔ چنانچہ اسکلا و ونیا میں اس کے زیر کمان جو فوج تھی اسے روما کی طرف بڑھنے اور پر تی ناکس، وہی پر تی ناکس جو پریتوری سپاہیوں کے ہاتھوں مارا گیا تھا، اس کا بدلہ لینے پر آمادہ کر لیا۔ اس بہانہ سے اور یہ ظاہر کئے بغیر کہ وہ تخت کا خواہاں ہے وہ روما کی طرف فوج بڑھا لایا۔ پیشتر اس کے کہ یہ پتہ چل سکے کہ وہ چل پڑا ہے وہ اطالیہ میں داخل ہو گیا۔ روما پہونچا تو سینیٹ نے خوف کے مارے اسے شہنشاہ منتخب کیا اور جولین کو قتل کروا ڈالا۔ اب زیویرس کو یہ شوق چرایا کہ پوری سلطنت کا مالک بنے۔ مگر اس کی راہ میں دو دقتیں حائل تھیں۔ ایک مشرق میں جہاں ایشیائی فوج کے سپہ سالار نگر نے اپنے شہنشاہ ہونے کا اعلان کر دیا تھا اور دوسری مغرب میں جہاں البنیس تھا اور اسے بھی تخت حاصل کرنے کی آرزو تھی۔ دونوں پر بیک وقت حملہ کرنے میں خطرہ تھا۔ اس لیئے اس نے فیصلہ کیا کہ نگر پر تو حملہ آور ہو اور البنیس کو چکمہ دے۔ چنانچہ البنیس کو اس نے یوں لکھا کہ سینیٹ نے

اسے یعنی زیویرس کو شہنشاہ منتخب کیا ہے مگر وہ اس اعزاز میں ایلنیس کو شریک کرنے پر تیار رہے اور اسی وجہ سے اس نے اس کے نام سیزز کا لقب روانہ کیا ہے۔ نیز یہ سینیٹ کا بھی یہی فیصلہ ہے کہ وہ ایلنیس کو اپنا شریک کار بنائے۔ ایلنیس کو ان تمام باتوں کا یقین آگیا۔ لیکن جب زیویرس نے نگر پر فتح پالی اور اُسے موت کے گھاٹ اتار دیا اور مشرقی معاملات کو سلجھا لیا تو وہ روم واپس آیا اور سینیٹ سے شکایت کی کہ ایلنیس اس کے تمام احسانات کو بالائے طاق رکھ کر سازش کر کے اسے قتل کروانے کی فکر کر رہا ہے اور وہ اسے اس احسان فراموشی کی سزا دینے پر مجبور ہے۔ اس کے بعد ایلنیس کی تلاش میں وہ فرانس گیا اور اسے نہ صرف تمام عہدوں اور منصبوں سے معزول کیا بلکہ اس سے اس کی زندگی بھی چھین لی۔

پس جو کوئی اس شہنشاہ کے کردار کو غور سے دیکھے گا اسے اس میں شیر کی پوری خونخواری اور لومڑی کی تمام چالبازی نظر آئے گی۔ اور اسے یہ بھی معلوم ہوگا کہ عوام الناس اس سے کس قدر خائف تھے اور اس کی کتنی عزت کرتے تھے۔ پھر بھی فوج اس سے نفرت نہ کرتی تھی۔ یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں کہ اس نے حکومت نئی نئی حاصل کی تھی پھر بھی وہ اتنی

بڑی سلطنت پر اپنا سکہ جما سکا۔ اس کی شہرت کی آب وتاب نے اسے ہمیشہ اس ناراضگی سے محفوظ رکھا جو سفاکی اور ستمگری کے سبب لوگوں میں پیدا ہوتی۔

لیکن اس کا بیٹا انتونی نس بہت ہی بڑا آدمی تھا۔ وہ نہایت ہی اعلیٰ صفات کا مالک تھا جس کی وجہ سے وہ قوم میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اور فوج میں مقبول تھا۔ وہ ایک جنگجو انسان تھا۔ وہ جانتا ہی نہ تھا کہ تکان کسے کہتے ہیں۔ پر تکلف کھانوں اور دوسرے تعیشات کو حقارت کی نظر سے دیکھتا تھا۔ یہی خوبیاں تھیں جن کی وجہ سے فوج اسے دل سے چاہنے لگی۔ تاہم اس کی سفاکی وخونخواری ایسی زبردست اور ایسی انوکھی تھی کہ اس نے پہلے روما میں ایک ایک کرکے اور پھر ایک ساتھ بے شمار لوگوں کو موت کے گھاٹ اتارا اور اسکندریہ میں کسی ایک کو بھی زندہ نہ چھوڑا۔ ساری دنیا اس سے نفرت کرنے لگی اور اس پاس کے ہوئے اس سے ڈرنے لگے۔ نوبت یہاں تک پہونچی کہ وہ اپنی ہی فوج کے سامنے ایک کپتان کے ہاتھوں مارا گیا۔ یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی شخص جان بوجھ کر اور اپنی زندگی سے مایوس ہو کر بادشاہ کو قتل کرنے کا ارادہ کرلیتا ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ بادشاہوں

میں کبھی بھی ایسی اموات واقع نہ ہوں اس لئے کہ جو کوئی
بھی اپنی جان عزیز نہیں رکھتا اُس کے لئے بادشاہ کو قتل
کرنا کوئی بڑی بات نہیں۔ مگر بادشاہ کو ایسے لوگوں سے
خائف ہونے کی ضرورت نہیں اس لئے کہ بس گنتی کے
چند لوگ ایسے ہوتے ہیں۔ البتہ اُسے اس بات کا خاص
خیال رکھنا چاہئے کہ اُس کے اپنے نوکر چاکر اور ریاست کے
وہ عہدہ دار جن کو اس سے قرب حاصل ہو انہیں کوئی بڑا
نقصان نہ پہنچنے پائے۔ انتونی نس نے اس اصول کا خیال
نہ رکھا اور اس کپتان کے ایک بھائی کو ذرا سی بات پر
قتل کر ڈالا۔ اور کپتان کو بھی آئے دن دھمکیاں دیتا رہا
مگر اُسے اپنے باڈی گارڈ میں رہنے دیا۔ بعد کے واقعات
سے ثابت ہوا کہ یہ بہت ہی نا عاقبت اندیشی کی بات تھی۔
اور یہی شہنشاہ کی بربادی کا باعث ہوئی۔

اب کمودس کی زندگی پر نظر ڈالئے اس کیلئے سلطنت کو قایم
رکھنا ذرا بھی دشوار نہ ہونا چاہئے تھا۔ مارکس کے بیٹے کی
حیثیت سے اُسے سلطنت ورثہ میں ملی تھی۔ اور قوم اور
سپاہ کو خوش رکھنے کے لئے اُسے بس اپنے باپ کے
نقش قدم پر چلنے کی ضرورت تھی۔ مگر اس کو کیا کیا جائے۔
اس کی طبیعت میں سفاکی اور بے دردی تھی۔ قوم کو لوٹنے

کی خاطر وہ فوج کو ہر طرح کی ڈھیل دیتا رہا اور ان کی بدکاریوں سے چشم پوشی کرتا رہا۔ برخلاف اس کے وہ اپنی عزت قائم نہ رکھ سکا کبھی پیشہ ور تیغ زنوں کے ساتھ مقابلہ کے لئے تماشاگاہ میں کود پڑتا۔ اور کبھی دوسری چھچھوری حرکتیں کرتا جو کسی طرح شہنشاہ کی شایانِ شان نہ تھیں اس طرح وہ فوج کی نظر میں ذلیل ہوگیا۔ جب ایک جماعت کو اس سے نفرت ہوگئی اور دوسری اسے حقیر سمجھنے لگی تو پھر وہ سازشوں کا شکار ہوا اور جان سے مارا گیا۔

اب ایک ماکسی می نس کی سیرت کا مطالعہ باقی ہے۔ وہ بہت جنگجو انسان تھا، الگزانڈر کا میں پہلے ذکر چکا ہوں، الگزانڈر کی فوج نسائیت سے متنفر تھی۔ اس لئے اُسے قتل کردیا اور اس کی جگہ ۔کسی مینز کو شہنشاہ بنایا۔ مگر اس منصب جلیلہ پر وہ بہت دنوں فائز نہ رہ سکا۔ دو باتوں نے اس کے خلاف نفرت اور حقارت پیدا کی ایک ذلیل سمجھے جانے کی وجہ یہ تھی کہ ایک زمانہ میں وہ تھریس میں بھیڑیں چرایا کرتا تھا۔ یہ بات عام طور پر لوگوں کو معلوم تھی اور ہر شخص اُسے بڑی بے عزتی کی بات سمجھتا تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ حکومت حاصل کرنے کے بعد اُس نے روما میں اور دوسرے مقامات پر عہدہ داروں کے

ذریعہ جو جو مظالم کئے ان کے سبب سے اس کی انتہائی سفاکی و خونریزی کا چرچا چاروں طرف ہوگیا۔ چنانچہ ساری دنیا میں اس کی رذالت کے سبب سے نفرت کی آگ بھڑک اٹھی اور اس کی بربریت نے سب پر خوف طاری کر دیا۔ پہلے افریقہ میں بغاوت ہوئی پھر سینیٹ اور اہل روما آخیرش تمام ملک اطالیہ اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس سازش میں اس کی فوج بھی شریک ہوگئی۔ اس وقت فوج عقیلہ کا محاصرہ کئے ہوئے تھی جس کا سر کرنا کچھ آسان نہ تھا۔ ایک تو اس کی سفاکی سے سپاہیوں میں خفگی پیدا ہوئی دوسرے اب جبکہ اتنی بڑی تعداد اس کی مخالف تھی ان کو اس کا زیادہ ڈر بھی نہ رہا اور انھوں نے اسے قتل کر دیا۔

ہیلیوگابلس، مکرنیس اور رجولین پر بحث کرنا بے سود معلوم ہوتا ہے۔ یہ سب کے سب نہایت ناکارے تھے اور جلد ہی ان کو رفع دفع کر دیا گیا۔ مگر اس موضوع کو ختم کرنے سے پہلے میں ایک بات کہوں گا۔ ہمارے زمانہ کے بادشاہوں کے لئے فوج کو راضی رکھنا پہلے کے مانند ضروری نہیں اس لئے کہ گو فوج کا کچھ نہ کچھ لحاظ اب بھی ضروری ہے مگر یہ ضرورت بہت دنوں باقی نہیں رہا

کرتی، اس لیے کہ موجودہ بادشاہوں کے پاس فوجیں ہی نہیں
جن کا سلطنتِ روما کی فوجوں کی طرح حکومت کی نشو نما اور
ریاست کے نظم و نسق میں پورا پورا حصّہ رہا ہو۔

گذشتہ زمانہ میں قوم کے مقابلے میں فوج کو مطمئن
رکھنا زیادہ ضروری تھا۔ مگر اب شہریارِ ترکیہ اور سلطان[1] کے
علاوہ اور بادشاہوں کے لئے زیادہ ضروری ہے کہ فوج کی
بہ نسبت قوم کو خوش رکھنے کی تدبیریں کریں، اس لئے کہ قوم
اب زیادہ طاقتور ہے۔

مندرجہ بالا کلیہ سے میں نے شہریارِ ترکیہ کو مستثنیٰ
کیا ہے۔ اس لئے کہ وہ بارہ ہزار پیادہ فوج اور پندرہ ہزار سوار
ہمیشہ اپنے پاس رکھتا ہے۔ انھیں پر اس کی بادشاہت کی
سلامتی اور طاقت کا دارومدار ہے۔ لہذا ضرورت ہے کہ قوم[2]
کا ذرا بھی خیال کئے بغیر وہ فوج سے دوستی برقرار رکھے۔
سلطان کی بادشاہت بھی اسی سے مشابہ ہے۔ فوج کا اس
پہ پورا پورا قبضہ ہے۔ بس سلطان کو اس کے سوا چارہ نہیں
کہ قوم کے مفاد کو نظر انداز کر کے فوج کو خوش رکھنے کی ممکن
سعی کرے۔ مگر یہ یاد رہے کہ سلطان کی ریاست اور تمام

---

[1] سلطان سے مراد سلطانِ مصر ہے۔ یہ حکومت ۱۵۱۷ء میں ختم ہوئی۔

[2] اشارہ ہے جانشینِ روم کی طرف۔

بادشاہتوں سے مختلف ہے۔ یوں کہ یہ عیسائی پاپائیت کی طرح ہے۔ جسے نہ تو موروثی بادشاہت کہا جا سکتا ہے اور نہ نئی قایم شدہ۔ اس لیئے کہ پرانے بادشاہ کے بیٹے وارث نہیں ہوتے وارث وہ ہوتا ہے جسے انتخاب کا حق رکھنے والے منتخب کریں اور رہیئے محض جماعت شرفا کے رکن ہوتے ہیں۔ یہ طریقہ چونکہ زمانہ قدیم سے چلا آرہا ہے اس کو نئی قایم شدہ بادشاہت بھی نہیں کہا جا سکتا اس لیئے کہ وہاں وہ دشواریاں نہیں پیش آتیں جن سے نئے بادشاہوں کو دوچار ہونا پڑتا ہے۔ بادشاہ نیا سہی ریاست کا دستور تو پرانا ہے اور وہ اس طرح وضع کیا گیا ہے کہ نئے بادشاہ کو ایسی حیثیت حاصل ہو گویا کہ وہ موروثی بادشاہ ہے۔

آئیے پھر موضوع بحث کی طرف لوٹیں۔ جو کوئی ان خیالات پر غور کرے گا اس کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ نفرت اور نفرت نہیں تو حقارت۔ مندرجہ بالا شہنشاہوں کی تباہی کا باعث ہوئی۔ وہ یہ بھی اچھی طرح سمجھ لے گا کہ کس طرح ان میں سے بعض نے ایک رویّہ اختیار کیا اور بعض نے اس کا بالکل متضاد رویّہ۔ پھر ان دونوں اقسام میں سے صرف ایک ایک بادشاہ کا تو اچھا انجام ہوا[1]۔ اور باقی کا برا۔

---

[1] مارکس اوررز یوریس

پرتی ناکس اور الکزانڈر نئے نئے بادشاہ بنے تھے۔ مارکس کے نقش قدم پر چلنا جو موروثی بادشاہ تھا۔ ان کے لئے بے سود اور نقصان دہ تھا۔ اسی طرح کراکلہ، کمودس اور میکسی مینس نے زیویرس کی نقل کرکے بڑی غلطی کا ارتکاب کیا اس لئے کہ اُن کے نقش قدم چلنے کے لئے جن خوبیوں کی ضرورت تھی وہ اس میں موجود نہ تھیں۔ لہٰذا جو بادشاہ نئی نئی حکومت حاصل کرے اُسے مارکس کی تقلید نہیں کرنی چاہیئے اسے چاہیئے کہ زیویرس سے وہ باتیں اخذ کرے جو ریاست کی بنا ڈالنے میں ممد ہوں۔ اور مارکس سے وہ جو پہلے سے مستحکم و استوار ریاست کو استقلال بخشنے میں مفید ہوں۔

# باب ۲۰

## قلعے اور اسی قسم کی اور چیزیں جنہیں بادشاہ کام میں لاتے ہیں مفید ہیں یا نقصان دہ؟

ریاست پر بے خطر حکمرانی کرنے کے لئے بعض بادشاہوں نے اپنی رعایا کے ہتھیار چھین لئے ہیں۔ بعض نے فریق بندی کے ذریعہ شہروں کو اپنے قابو میں رکھا ہے۔ ایسے بادشاہ بھی ہیں جنہوں نے اپنے خلاف عداوت کو بڑھایا ہے۔ اور ایسے بھی جنہوں نے ان لوگوں کو رام کرنے کی خاص کوشش کی ہے جن پر اپنی حکومت کے ابتدائی زمانہ میں وہ اعتماد نہ کرتے تھے۔ بعض نے قلعے تعمیر کروائے ہیں اور بعض نے قلعوں کو توڑوا کر برباد کر دیا ہے۔ گو ان کے متعلق کوئی قطعی رائے اس وقت تک نہیں دی جا سکتی جب تک ان ریاستوں کے حالات سے جہاں یہ فیصلے ہوئے کما حقہ آگاہی نہ ہو۔ تاہم جس حد تک موضوع اجازت دے گا میں ان کا ذکر جامع

طور پر کروں گا۔

ایسا نیا بادشاہ کوئی نہیں گزرا ہے جس نے اپنی رعایا کو نہتا کیا ہو۔ یہی نہیں جب کبھی اسے نہتا پایا تو ہمیشہ مسلح کیا۔ اس لئے کہ اسے مسلح کرنے سے بادشاہ کی طاقت میں اضافہ ہوتا ہے جن پر پہلے اعتبار نہ تھا وہ وفادار بن جاتے ہیں اور جو خود وفادار تھے ان کی وفاداری میں کسی قسم کا فرق نہیں آنے پاتا۔ رعایا اپنے بادشاہ کا گن گانے لگتی ہے۔ تمام رعایا کو ہتھیاروں سے مسلح کرنا تو ممکن نہیں۔ پھر بھی بادشاہ جن کو مسلح کرے گا۔ ان کو اگر فائدہ ہوگا تو وہ دوسروں کو زیادہ آسانی سے قابو میں رکھ سکے گا۔ مسلح لوگ اس سلوک کی وجہ سے جو بادشاہ نے ان کے ساتھ کیا اس کی طرف کھنچیں گے۔ رہے اور لوگ سو بادشاہ کو قابل معافی سمجھیں گے اس خیال سے کہ جنہیں زیادہ خطرات کا سامنا کرنا ہو اور جن کی ذمہ داری بڑی ہو انھیں صلہ بھی ویسا ہی ملنا چاہئے۔ لیکن جب بادشاہ ان سے ہتھیار چھینتا ہے تو وہ اس پر ناراض ہوتے ہیں اس لئے کہ وہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ بادشاہ ان پر بھروسہ نہیں کرتا۔ یا انھیں بزدل سمجھتا ہے یا بے وفا۔ اور یہ دونوں باتیں ایسی ہیں جن سے بادشاہ کے خلاف نفرت پھیلتی ہے۔ اور ریاست غیر مسلح تو رہ نہیں

سکتی۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بادشاہ زر آشنا سپاہ سے کام نکالنا چاہتا ہے۔ جن کی سیرت پر میں پہلے ہی تبصرہ کر چکا ہوں۔ اور وہ اچھے بھی ہوں تو بہت طاقتور دشمنوں اور ناقابل اعتماد رعایا کے مقابلہ کی تاب نہیں لا سکتے۔ اسی وجہ سے جیسا میں نے اوپر کہا ہے ہر نئی ریاست میں نئے بادشاہ نے ہمیشہ ہتھیار تقسیم کئے ہیں۔ تاریخیں اس قسم کی مثالوں سے بھری پڑی ہیں۔ لیکن جب کوئی بادشاہ نئی ریاست حاصل کرے جسے وہ اپنی پرانی ریاست میں بطور ایک صوبہ کے شامل کرے تب ضروری ہے کہ سوائے ان لوگوں کے جنہوں نے ریاست حاصل کرنے میں اس کی مدد کی اور لوگوں کے ہتھیار چھین لے۔ اور ایسا انتظام کرنا چاہئیے کہ یہ مدد کرنے والے بھی آہستہ آہستہ آرام طلب زنخے بن جائیں۔ نیز نئی ریاست میں جتنے بھی اسلحہ ہوں اُن پر اس کے اپنے سپاہی قابض ہوں۔ جو پرانے مقبوضات ہیں اس کی خدمت کرتے رہے ہوں۔

ہمارے آباؤ اجداد اور جنہیں عاقل و دانا خیال کیا جاتا تھا اکثر کہا کرتے تھے کہ پستوئیا پر فرقہ بندیوں سے اور رپیسا پر قلعوں کی مدد سے حکومت کرنی چاہئیے۔ اسی خیال کے ماتحت وہ بعض باج گزار شہروں میں نفاق کا

بیچ بوتے رہے تاکہ ان کو آسانی سے اپنے قبضے میں رکھ سکیں۔ ممکن ہے اس زمانہ میں جب اطالیہ میں ایک طرح کا توازن قایم تھا۔ یہ تدبیر مناسب رہی ہو۔ اس پر موجودہ زمانہ میں عمل نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے کہ میرے خیال میں فرقہ بندی سے کام نہیں چل سکتا۔ بلکہ میرا تو یقین ہے کہ جب دشمن ایسے شہروں پر حملہ آور ہوگا۔ جو نفاق و انتشار کا شکار رہیں تو وہ آسانی سے انھیں فتح کرے گا اس لئے کہ کمزور ترین جماعت بیرونی فوجوں کا ساتھ دے گی۔ اور دوسری جماعت مقابلہ کی تاب نہ لا سکے گی۔ اہل وینس نے غالباً اس سبب سے ان شہروں میں جو ان کے ماتحت تھے پاپائی اور شہنشاہی فرقوں کو فروغ دیا۔ اور گو انھوں نے کبھی خونریزی نہ ہونے دی لیکن مناقشہ اور منازعہ کی آگ اندر اندر سلگاتے رہے تاکہ آپس کے تفرقوں کی وجہ سے وہ اہل وینس کے خلاف متحد نہ ہو سکیں۔ مگر جیسا کہ دنیا نے دیکھا اہل وینس کی یہ توقعات پوری نہ ہو پائیں۔ اس لئے کہ وائلا کی شکست فاش کے بعد ایک جماعت نے ہمت سے کام لیا اور وہ ریاست پر قابض ہو گئی۔ پس یہ طریقے بادشاہ کی کمزوری پر دلالت کرتے ہیں۔ طاقتور ریاستوں میں فرقوں کو کبھی پنپنے نہیں دیا جاتا۔ ممکن ہے امن و امان کے زمانے میں

---

سلہ ۱۴ مئی سنہ ۱۵۰۹ء۔ کمبرائی کی لیگ اور وینس کی جنگ میں۔

کیا جائے تو ہمیں معلوم ہوگا کہ بادشاہ کے لئے یہ زیادہ سہل ہے کہ ان لوگوں سے دوستی پیدا کرے جو پرانی حکومت کے تحت خوش اور مطمئن تھے اور اس وجہ سے اس کے دشمن ہیں۔ ان لوگوں کو دوست بنانا زیادہ مشکل ہے جنہوں نے غیر مطمئن ہونے کی وجہ سے نئے بادشاہ کی طرفداری کی اور اسے ریاست پر قابض ہونے کے لئے اکسایا۔[1]

یہ طریقہ چلا آتا ہے کہ اپنی ریاستوں کو زیادہ محفوظ رکھنے کے لئے بادشاہ قلعے بنواتے ہیں۔ تاکہ سازشیوں کی روک تھام ہو سکے اور انہیں اپنے ارادوں سے باز رکھا جا سکے اور اگر ضرورت ہو تو یہ جائے پناہ کا کام دیں۔ یہ طریقہ قابل تعریف ہے اس لئے کہ ایک زمانہ میں نکولو ویتیلی نے چینو دی کاستیلو کے دو قلعے اس لئے منہدم کرا دیئے کہ اس ریاست پر قابض رہ سکے۔[2] گوئیدو ابالدو، ڈیوک آف اربینو جب اپنی مملکت میں واپس آیا جہاں سے اسے سیزرے بورجیا نے

---

[1] یہاں جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے ان کا تعلق میکیاولی کی اس آرزو سے ہے کہ میڈیچی اس کو اپنی ملازمت میں لے لیں۔ ملاحظہ ہو میکیاولی کا خط فرانسسکو ویتوری کے نام (مورخہ ۱۰ دسمبر ۱۵۱۳ء)

[2] پوپ سکسٹس نے اسے شہر سے نکال دیا تھا۔ جب پوپ کی موت کے بعد ۱۴۸۲ء میں وہ واپس آیا تو اس نے پوپ کے بنائے ہوئے دونوں قلعے منہدم کروا دیئے۔

[3] ۱۵۰۲ء میں۔

نکال باہر کیا تھا تو اس نے اس صوبے کے تمام قلعوں کو مسمار کروا دیا
اس کو خیال تھا کہ قلعے ہوں گے تو ملک آسانی سے ہاتھ سے نہیں
جانے کا۔ بنتی وولی جب بولونا واپس آئے تو انہوں نے بھی
یہی فیصلہ کیا۔[1] پس قلعے مفید یا غیر مفید ہوتے ہیں حالات کے
اعتبار سے ایک طرف ان سے فائدہ ہوتا ہے تو دوسری
طرف نقصان۔ یوں سمجھئے کہ جو بادشاہ غیر ملکیوں کی نسبت اپنی
رعایا سے زیادہ خائف ہو اسے قلعے بنوانے چاہئیں اور جو
رعایا کی نسبت غیر ملکیوں سے زیادہ ڈرتا ہو اسے اس سے
باز رہنا چاہئے۔ میلان کے قلعہ کی وجہ سے جس کو فرانسسکو
اسفورزا نے تعمیر کروایا۔ خاندان اسفورزا کو اب تک جتنی
مصیبتیں جھیلنی پڑی ہیں اور آئندہ بھی جھیلنی پڑیں گی ان کے
سامنے دوسرے ہنگامے کچھ حقیقت نہیں رکھتے۔[2] پس بہترین
قلعہ ہے: قوم کی نفرت سے بچنا، اس لئے کہ ممکن ہے کہ قلعہ
پر قبضہ باقی رہے مگر یہ قبضہ بیکار ثابت ہو اور اگر بادشاہ
سے قوم کو نفرت ہو گی تو یہ بیکار رہو گا اس لئے کہ ایسے غیر
ملکیوں کی کبھی کمی نہ ہوگی جو بادشاہ کے خلاف لڑنے والوں کی

---

[1] سنہ ۱۵۱۲ء میں جو قلعے مسمار کرائے گئے وہ پوپ جولیس دوم نے بنوائے تھے

[2] اس خاندان کے ارکین کو قلعوں پر کچھ ایسا بھروسہ تھا کہ انہوں نے قوم کی خوشنودی
کو بالکل پس پشت ڈال دیا۔ اور قوم نے فرانس کو اپنا نجات دہندہ خیال کیا۔

کی امداد کرنے کو تیار رہوں۔ موجودہ زمانہ میں اس قسم کے قلعے کسی بادشاہ کے لئے مفید ثابت نہیں ہوئے سوائے کاؤنٹس آف فورلی کے کہ اس کے شوہر کاؤنٹ ژیرولامو کے قتل[1] کے بعد اس نے قلعوں سے فائدہ اٹھایا۔ وہ کامیابی کے ساتھ عوام الناس کے پہلے حملے کا مقابلہ کر سکی تا آنکہ میلان سے امداد پہنچی[2] اور اس طرح ریاست پر اس کا دوبارہ قبضہ ہو گیا۔ صورت حالات اس وقت کچھ ایسی تھی کہ غیر ملکی باغیوں کی مدد نہ کر پاتے مگر بعد میں جب سیزر بورژیا نے[3] اس پر حملہ کیا اور جب قوم جو اس کی دشمن تھی غیر ملکیوں کے ساتھ مل گئی تو یہ قلعے اس کے لئے کچھ زیادہ مفید ثابت نہیں ہوئے۔ پس اس وقت بھی اور اس سے پیشتر بھی اس کے لئے یہی بہتر تھا کہ قلعوں کی بجائے اپنے خلاف قوم میں نفرت نہ پھیلنے دیتا۔ غرض موضوع کے ہر پہلو پر غور کرنے سے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ جو قلعے بنوائے وہ بھی قابل تعریف ہے اور جو نہ بنوائے وہ بھی۔ قابل الزام میرے خیال میں وہ بادشاہ ہے جو قلعوں پر بھروسہ کر کے قوم کی نفرت کو کچھ نہیں سمجھتا ہو۔

---

[1] مورخہ ۱۴ اپریل ۱۴۸۸ء [2] مدد پہونچائی لودووی کو اسفورزا نے؟
[3] سیزارے بورزیا کو ۱۲ جنوری ۱۵۰۰ء کو فتح حاصل ہوگی۔

# باب ۲۱

## بادشاہ ناموری کیونکر حاصل کرسکتا ہے؟

بادشاہ کی جتنی عزت بڑی مہموں اور اچھی مثال قایم کرنے سے ہوتی ہے اور کسی چیز سے نہیں ہوتی۔ موجودہ زمانہ میں فرڈنینڈ اراگانی[1] شاہ ہسپانیہ کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ اسے ایک معنی میں نیا بادشاہ کہہ سکتے ہیں۔ ایک وقت تھا کہ وہ نہایت ہی غیر اہم بادشاہ تھا اور اب دیکھیے تو وہ اپنی شہرت کی بدولت تمام عیسائیت کا سب سے بڑا تاجدار ہے۔ اس کے کارناموں پر نظر دوڑائی جائے تو وہ سب بہت عظیم الشان اور ان میں سے بعض تو نہایت ہی غیر معمولی معلوم ہوں گے۔ اپنی بادشاہت کے ابتدائی زمانہ میں اس نے غرناطہ پر حملہ کیا اور اسی مہم سے دراصل اس کی عظمت کی بنیاد پڑی[2]۔ شروع میں وہ اطمینان

---

[1] ۱۴۵۲ء تا ۱۵۱۶ء

[2] ۱۴۹۲ء

کے ساتھ بغیر کسی مداخلت کے خطرے کے جنگ کرتا رہا اور کاستیل کے جاگیرداروں کو اس میں اس طرح مصروف رکھا کہ انھیں اپنے ملک کی اندرونی تبدیلیوں پر غور کرنے کی فرصت ہی نہ ملی۔ اس دوران میں غیر محسوس طور پر اس نے ان پر اپنا سکہ جما لیا اور اپنی حکومت قائم کر لی۔ کلیسا اور اپنی رعایا کے روپے سے اس نے فوج کا خرچ چلایا اور طویل جدوجہد کے دوران میں اس نے اپنے اس فوجی تفوق کی بنا ڈالی۔ جس کی وجہ سے بعد میں اس نے اتنی ناموری حاصل کی۔ اس کے حوصلے اور بڑھتے گئے تو وہ مذہب کی آڑ پکڑ کر "دیندارانہ ظلم" پر اتر آیا اور عربوں کو اپنی قلمرو سے باہر کیا[1]۔ اس سے بڑھ کر عجیب اور غیر معمولی کارنامہ تصور میں نہیں آ سکتا۔ مذہب ہی کی آڑ لیکر اس نے افریقہ پر دھاوا بولا[2]، اطالیہ پر چڑھائی کی[3] اور آخر میں فرانس پر بھی حملہ کیا[4]۔ وہ چونکہ برابر بڑے منصوبوں کی تیاری اور ان کو عملی جامہ پہنانے میں لگا رہتا تھا اس وجہ سے اس کی رعایا انتظار کی حالت میں رہتی اور تحسین و توصیف اور اس کے کارناموں کے نتائج پر غور و خوض میں لگی رہتی۔

---

[1] سنہ ۱۴۹۲ء کے ملک بھر تمام عربوں اور یہودیوں کو خارج کر دیا گیا۔

[2] سنہ ۱۵۰۹ء

[3] نیپلس کو فتح کرنے کے لیے سنہ ۱۵۰۱ء۔

[4] سنہ ۱۵۱۲ء میں۔ دراصل نوارا پر حملہ کیا جس کی پشت پر فرانس تھا۔

کام ایسے تھے کہ ایک میں سے دوسرا برابر نکلتا چلا آتا، اور مخالفت کے لئے رعایا کو نہ وقت مل پاتا نہ موقع۔

دوسری بات یہ ہے کہ ریاست میں اندرونی حکومت چلانے کے لئے بادشاہ ایسے طریقوں سے فائدہ اٹھا سکتا ہے جو جاذب توجہ ہوں۔ جیسا کہ میسر برنابو مالان کی مثال سے ظاہر[1] ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب کوئی شخص غیر معمولی طور پر اچھا یا برا کام کرے تو بادشاہ اس کا صلہ یا پاداش دینے کے لئے ایسے طریقے اختیار کرے جس کا خوب چرچا ہو سکے۔ لیکن بادشاہ کے لئے سب سے اہم بات یہ ہے کہ وہ اپنے کاموں سے اپنی عظمت اور نیکی کا خیال لوگوں کے دلوں میں پیدا کرے۔ اسی طرح وہ بادشاہ بہت عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے جو دوست ہو تو پکا دوست ہو اور دشمن ہو تو جانی دشمن یعنی یہ کہ وہ کھلم کھلا ایک کا ساتھ دے اور دوسرے کی مخالفت کرے۔

یہ طریقہ غیر جانبداری سے کہیں زیادہ فائدہ مند ہے۔

تھوڑی دیر کے لئے فرض کیجئے کہ آپ کے دو طاقتور پڑوسی آپس میں لڑ پڑتے ہیں۔ اب ان میں سے جس کسی کی جیت ہوگی اس سے یا تو آپ خائف ہوں گے یا نہیں۔ دونوں صورتوں میں آپ کے لئے یہی مناسب ہوگا کہ ان میں

---

[1] سنہ ۱۳۵۴ء سے سنہ ۱۳۸۵ء تک اس نے اپنے بھائی گلیاتسو کے ساتھ مل کر حکومت کی

سے ایک کو آپ علی الاعلان ساتھ دیں۔ آپ یہ نہ کریں گے تو جس سے آپ کو اندیشہ تھا۔ وہ فاتح ہونے کے بعد آپ کی اچھی طرح خبر لے گا اور مفتوح کو آپ کی یہ حالت دیکھ کر بہت خوش ہوگا۔ آپ کے پاس ایک بھی سبب یا بہانہ نہ ہوگا جس سے آپ اپنی مدافعت کر سکیں۔ اس لئے کہ فتح ناقابل اعتبار دوستوں کو عزیز نہیں رکھتی اور نہ ان کو جو آڑے وقت میں اس کے کام نہ آویں۔ اور مفتوح پر آپ کا کیا احسان جب آپ کے ہاتھ میں تلوار ہو لیکن اُس کے دوش بدوش کھڑے نہ ہوں۔

جب اہل ایٹولیہ کے ایما سے انتیوکس اہل روما کو خارج کرنے کے لئے یونان میں داخل ہوا تو اس نے اکایوں کے پاس ایسے ایلچی بھیجے جن کے اہل روما سے دوستانہ تعلقات تھے اور اُن کو غیر جانب دار رہنے کی تعیین کی۔ برخلاف اُس کے اہل روما نے یہ تاکید کی کہ وہ اُن کی طرف سے جنگ میں شریک ہوں۔ جب یہ مسئلہ اکایوں کی مجلس کے سامنے پیش ہوا تو انتیوکس کے سفیر نے پھر غیر جانبداری پر زور دیا۔ اُس پر روما کے ایلچی نے یہ جواب دیا: "تم سے یہ کہا جا رہا ہے کہ تمہارے اختیار کرنے کے لئے غیر جانبداری سے بہتر اور فائدے والی اور کوئی راہ نہیں۔ مگر میرا خیال ہے کہ

تمہارے لئے اس سے زیادہ مفر طریقۂ عمل ممکن نہیں۔ اس
لئے کہ غیر جانبدار رہو گے تو نہ کسی کے شکریہ کے مستحق
ٹھیرو گے اور نہ تمہیں شہرت ہی نصیب ہوگی۔ فاتح کے لئے
بس مال غنیمت بن کر رہ جاؤ گے۔ ہمیشہ یہی ہوگا کہ جو تمہارا
دوست نہ ہوگا وہ تمہیں غیر جانبداری کی دعوت دے گا
اور جو تمہارا دوست ہوگا وہ تم سے اپنی شرکت کا صاف
اعلان کرنے کے لئے کہے گا۔ ارادے کے کچے بادشاہ فوری
خطرے سے بچنے کے لئے اکثر غیر جانبداری کا راستہ اختیار
کرتے ہیں اور اس سے اکثر تباہ ہوتے ہیں۔ لیکن اگر ہمت
کرکے ایک یا دوسرے فریق کی طرفداری کا اعلان کردو گے
تو پھر جس فریق کا تم نے ساتھ دیا ہے اگر وہ جیت گیا تو وہ
ہزار طاقتور ہو اور تم بالکل اس کے قبضہ قدرت میں سہی مگر
وہ تمہارے زیر احسان ہوگا اور انسان بے شرم بھی کوئی کیا
ہوگا کہ یقینی طور پر احسان فراموشی کرکے اسی کو تباہ و برباد
کرے جو ضرورت کے وقت اس کے کام آیا ہو۔ علاوہ بریں
فتوحات کبھی بھی اتنی مکمل نہیں ہوا کرتیں کہ فاتح ہر طرح کے
لحاظ خصوصاً عدل و انصاف کو بالائے طاق رکھ سکے۔ برخلاف
اس کے اگر تمہارے ساتھی کو شکست ہو تو وہ تمہارا ہمیشہ خیال
کرے گا۔ جہاں تک اس سے ہو سکے گا وہ تمہاری مدد میں

دریغ نہیں کرے گا۔ تمہارا مستقبل اس کے مستقبل کے ساتھ منسلک ہو جائے گا اور ممکن ہے کہ کبھی اس کا نصیب جاگے۔

دوسری صورت میں یعنی جب دونوں فریقوں کی طاقت اتنی محدود ہو کہ کوئی بھی جیتے تمہیں اس سے کوئی خطرہ نہ ہو تب تو تمہارے لئے اور بھی زیادہ ضروری ہے کہ ایک کے شریک ہو جاؤ، اس لئے کہ ایک کی مدد سے تم دوسرے کو تباہ کر سکو گے تمہارے ساتھی میں اگر ذرا بھی عقل ہو گی تو وہ دوسرے کو تباہ ہونے سے بچا لے گا۔ اب اگر تمہارے ساتھی کو فتح ہوئی اور تمہاری مدد سے فتح ہو ہی جائے گی تو وہ تمہارے قبضہ میں ہو گا۔

یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ حملہ کرتے وقت بادشاہ کو خود اپنے سے زیادہ طاقتور فریق کا ساتھ کبھی نہیں دینا چاہیے یہ اور بات ہے جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ مجبوراً اسے ایسا کرنا پڑے۔ اس لئے کہ اگر وہ جیت گیا تو تم اس کے پنجے میں ہو گئے۔ اور جہاں تک ہو سکے بادشاہوں کو چاہیے کہ کسی دوسرے کے پنجے میں نہ پھنسیں گو اہل وینس اس دعوت اتحاد کو رد کر سکتے تھے مگر انہوں نے میلان کے ڈیوک کے خلاف فرانس کا ساتھ دیا اور اسی سے ان کی

---

۱؎ سنہ ۱۴۹۹ء میں۔

تباہی ہوئی لیکن جب اتحاد کے سوا چارہ نہ ہو جیسا کہ اہل فلورنس کے ساتھ پیش آیا جب پاپائے روما اور ہسپانیہ نے اپنی فوجوں کے ساتھ رومارڈی پر چڑھائی کی غرض مندرجہ بالا اسباب کی بناء پر بادشاہ کو ایک فریق کا ساتھ دینا لازمی ہے۔ پھر کوئی یہ نہ سمجھ بیٹھے کہ ریاست اپنے لئے ایسی راہِ عمل منتخب کر سکتی ہے جس میں کسی قسم کا خطرہ ہوری نہیں۔ وہ جو راہ بھی اختیار کرے اسے یہ سمجھ لینا چاہئے کہ اس کے متعلق یقین کے ساتھ تو کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اس لئے کہ انسانی معاملات میں اکثر یہی ہوا کرتا ہے کہ ایک فتنہ سے بچنے کے لئے انسان دوسرے فتنہ میں جا پھنستا ہے۔ دانائی کا راز اسی میں پنہاں ہے کہ انسان نقصانوں کو خوب تولے اور جو کم برا نظر آئے اسے اچھا سمجھ کر قبول کرے۔

علاوہ ازیں بادشاہ کو چاہئے کہ اپنے آپ کو خوبی کا قدردان ظاہر کرے۔ اور جو بھی کسی فن میں کمال رکھتے ہوں ان کی عزت افزائی کرے۔ اسے اپنی رعایا کی ہر طرح ہمت افزائی

---

لے نوزدہ از دہم اور مقدس لیگ کے مابین جو جنگ ہوئی اس میں اہل فلورنس نے غیر جانبداری اختیار کی۔ نتیجہ ہوا جمہوریت فلورنس کی تباہی اور میدیچی کا دوبارہ برسر اقتدار ہونا۔

کرنا چاہئے تجارت ہو، چاہے کوئی اور پیشہ ہر شخص اطمینان
و سکون کے ساتھ اپنا کام کرسکے۔ یہ نہ ہو کہ کوئی فرد
اس ڈر سے اپنے مقبوضات کو بہتر بنانے کا خیال ترک کر دے
کہ وہ اس کے ہاتھ سے جاتے رہیں گے، یا محصولوں کے ڈر
سے نئی تجارت نہ شروع کرے، جو لوگ ان کاموں میں لگنا
چاہیں اور جو اپنے شہر یا ریاست کی عظمت بڑھانے کے خواہاں
ہوں اُن پر بادشاہ کو انعام و اکرام کی بارش کرنی چاہیے۔
مناسب موقعوں پر بادشاہ کو جشنوں اور تماشوں کے
ذریعے قوم کی خاطر تواضع کرنی چاہیے اور چونکہ تمام شہر برادریوں
یا کارخانوں میں منقسم ہوتے ہیں اُسے ان مجمعوں کی طرف بھی
توجہ کرنی چاہیے اور کبھی کبھار ان میں شرکت کرنی چاہیے کہ
اُس کی خوش خلقی اور سخاوت سب پر ظاہر ہو، مگر اسے اپنے
منصب کی شان ہمیشہ برقرار رکھنی چاہیے۔ اب نہ ہو کہ اس میں
ذرا سی بھی کمی واقع ہو۔

# باب ۲۲

## بادشاہوں کے معتمد!

وزیروں کا انتخاب بادشاہ کے لئے کچھ کم اہمیت نہیں رکھتا ان کا بھلا یا برا ہونا بادشاہ کی مصلحت اندیشی پر موقوف ہے۔ چنانچہ بادشاہ کی سیرت اور دانائی کا صحیح اندازہ لگانے کا سب سے سہل طریقہ یہ ہے کہ اُس کے آس پاس کے لوگوں کو دیکھا جائے۔ اگر وہ لائق بھی ہوں اور وفادار بھی تو سمجھنا چاہئے کہ بادشاہ ضرور عقلمند ہے، یوں کہ اُس نے ان کی خوبی کو پہچانا اور اُن کی وفاداری کو برقرار رکھا۔ اور وزرا دوسری طرح کے ہوں تو پھر بادشاہ کے متعلق ہمارا فیصلہ مختلف ہونا لازمی ہے، یوں کہ اُن کے منتخب کرنے میں وہ پہلے ہی دھوکا کھا چکا ہے جو کوئی انتونیو داوَنیا فرو[1] کو شاہ سینا، پاندلفو، پیترو چی کے ملازم کی حیثیت سے

---

[1] مشہور معلم قانون اور بعد میں وزیر سال پیدائش ۱۴۵۹ء سال وفات ۱۵۳۰ء

جانتا تھا اُس کے لئے ممکن نہ تھا کہ جس دانائی کا ثبوت پانڈوتو نے دینا (دو کو ملازم رکھ کر) دیا اس کا قائل نہ ہو۔ اس لئے کہ دماغ تین طرح کا ہوتا ہے ایک وہ جس میں خود سمجھنے کی صلاحیت ہو دوسرے وہ جو دوسرے کے سمجھنے سے فائدہ اٹھا سکے اور تیسرے وہ جو نہ تو خود سمجھ سکے اور نہ دوسروں کو دیکھ کر فائدہ اٹھا سکے۔ پہلی قسم کے کیا کہنے۔ دوسری بھی غنیمت ہے مگر تیسری بالکل بے کار ہے۔ یہ ماننا پڑے گا کہ پانڈوتو پہلی قسم سے نہیں تو دوسری قسم سے ضرور تھا۔ اس لئے کہ دوسرے جو کچھ کہیں یا کریں اس کے بارے میں بادشاہ اچھے برے کی تمیز کر سکے، چاہے اس میں جدت کا مادہ ذرا بھی نہ ہو تو کم از کم اپنے نوکر کی خوبیاں اور عیوب کو پہچان سکے گا اور دوسرے کی اصلاح کر سکے گا ایسے آقا کو نوکر دھوکا نہ دے سکے گا اور ٹھیک ٹھیک خدمت انجام دے گا۔

کسی ملازم کے متعلق رائے قائم کرنے کے لئے اگر بادشاہ اُسے اس کسوٹی پر پرکھے گا تو کبھی دھوکا نہ کھائے گا، جو ملازم بادشاہ کے مفاد سے زیادہ اپنے مفاد کو پیش نظر رکھتا ہے اور اندرونی طور پر اپنے ذاتی مفاد کی فکر میں لگا رہتا ہے وہ کبھی بھی اچھا ملازم نہیں

ہو سکتا۔ بادشاہ کسی صورت میں اس پر بھروسہ نہیں کر سکتا۔ اس لئے کہ جس کسی کے ذمہ ریاست کا انتظام ہو اُسے اپنے آپ کو سرے سے بھلا دینا چاہئے اور ہر وقت بادشاہ کا خیال رکھنا چاہیے۔ اس کا دھیان ان معاملات کی طرف جانا ہی نہ چاہئے جو بادشاہ سے متعلق نہ ہوں۔

تصویر کا دوسرا رُخ یہ ہے کہ اگر اپنے نوکر کی ایمانداری برقرار رکھنا مقصود ہو تو بادشاہ کو چاہئے کہ اس کا ہر طرح خیال رکھے، اس کی عزت افزائی کرے، اس کی دولت بڑھائے، اس پر ہر طرح کے احسان کرے اور مختلف عزت بڑھانے والے اور غیر ہر دلعزیز بنانے والے کاموں میں اس کا شریک ہو تاکہ ان سب باتوں سے اس پر یہ واضح ہو جائے کہ بغیر بادشاہ کے اس میں اپنے پاؤں پر خود کھڑے ہونے کی صلاحیت نہیں ہے۔ اس کی اس قدر عزت افزائی کرے کہ اس کو اور اعزاز کی ہوس نہ ہو پائے اور اسے اتنا مالا مال کر دے کہ مزید دولت کی خواہش اس کے دل میں نہ پیدا ہو اور اس کی غیر ہر دلعزیزی اس کے دل میں تبدیلیوں کا خوف ڈال دے۔ جب بادشاہ اور اُس کے ملازمین کے آپس کے تعلقات اس نہج پر قایم ہو جائیں گے تو وہ ایک دوسرے پر پورا پورا اعتماد کر سکیں گے، اور یہ صورت نہ ہوگی تو ضرور ایک نہ ایک کا برا انجام ہوگا۔

# باب ۲۳

## چاپلوسوں کو پاس نہ پھٹکنے دو

اس موضوع کے ایک اہم پہلو کو میں نظر انداز نہیں کرنا چاہتا۔ اس لیئے کہ یہ خطرہ ایسا ہے کہ اگر بادشاہ بہت محتاط اور ممیز نہ ہوں تو اس سے بچ کر نکلنا بہت مشکل ہے۔ یہ خطرہ خوشامدیوں سے ہوتا ہے جن سے شاہی دربار بھرے پڑے ہیں اس لیے کہ لوگ اپنے امور میں ایسے مگن ہوتے ہیں اور ان کے بارے میں انہیں کچھ ایسا مغالطہ ہوتا ہے کہ وہ شاذو نادر اس موذی مرض سے محفوظ رہتے ہیں۔ اور حفاظت کی تدبیر کرتے ہیں تو ذلیل و خوار ہونے کا ڈر ہوتا ہے۔ چاپلوسوں سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کا سوائے اس کے اور کوئی طریقہ نہیں کہ لوگوں کو اچھی طرح بتا دیا جائے کہ سچ بات سے بادشاہ خفا نہیں ہوتا۔ مگر دقت یہ ہے کہ ہر شخص نے بادشاہ کو کھری کھری سنانا شروع کیں تو بادشاہ کی وقعت خاک میں مل جائیگی

یہی وجہ ہے کہ بادشاہ کو ایک تیسرا راستہ اختیار کرنا چاہیئے۔ وہ اپنی ریاست کے عقل مند لوگوں کو منتخب کرے اور انہیں اپنے سامنے سچ بولنے کی آزادی دے۔ یہ بھی صرف اُن امور سے متعلق جن کے بارے میں وہ اُن سے خود دریافت کرے۔ دوسرے امور پر وہ زبان کھولنے کے مجاز نہ ہوں۔ لیکن اُسے چاہیئے کہ ہر معاملے پر اُن سے سوالات کرے۔ ان کی رائے کو اچھی طرح سمجھے۔ اور بعد میں خود سوچ سمجھ کر فیصلہ کرے۔

ان مشیروں کے ساتھ فرداً فرداً اور بہ حیثیت مجموعی اس کا رویہ ایسا ہو کہ ان میں سے ہر شخص یہ بخوبی جان لے کہ وہ جتنی آزادی کے ساتھ بادشاہ کے سامنے گفتگو کرے گا اُسی قدر اُسے ترجیح دی جائے گی۔ اُن کے علاوہ کسی اور کی بات پر کان نہ دھرنا چاہیئے۔ جو بات ایک دفعہ طے ہو جائے اس پر بادشاہ کو کاربند ہونا اور اپنے قصد پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہنا چاہیئے۔ جو بادشاہ اس کے برخلاف عمل کرے گا وہ یا تو چاپلوسوں کے ہاتھوں تباہ ہوگا یا تذبذب کی وجہ سے ذلیل و خوار ہوگا۔

اس موضوع پر ایک نئی مثال پیش کرنا چاہتا ہوں۔ بابا لوچیا[1] جو دو

---

[1] لوچیا رائنالدی۔ میکیاولی کی ملاقات ۱۵۰۷ء اور ۱۵۰۸ء میں جرمنی میں ہوئی تھی۔ اس زمانے میں وہ جمہوریت فلورنس کے سفیر کی حیثیت سے ٹیرول میں مقیم تھا۔

شہنشاہ، کسی میلین سے کرتا دھرتا ہیں مجھ سے شہنشاہ کے متعلق
یوں کہا کہ وہ کسی کے ساتھ مشورہ نہیں کرتا، مگر پھر بھی کسی معاملہ
تک صرف اپنی رائے پر عمل نہیں کرتا ہے۔ بات یہ ہے کہ شہنشاہ
اخفائے راز کا بہا دلدادہ ہے۔ وہ اپنے منصوبوں کا کسی سے
ذکر نہیں کیا کرتا اور نہ اُن پر دوسروں کی رائے لیتا ہے۔ مگر
جب اُن پر عمل پیرا ہوتے وقت وہ دوسروں پر عیاں ہو جاتے
ہیں تو اردگرد کے لوگ راہ میں طرح طرح کے روڑے اٹکاتے
ہیں۔ اور چونکہ اس کی طبیعت اثر پذیر واقع ہوئی ہے وہ مجبور ہو
کر ان سے ٹکرا جاتا ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے وہ آج جو کچھ بناتا ہے
کل بگاڑ دیتا ہے۔ کسی کو یہ اندازہ نہیں ہو پاتا کہ آخر وہ کرنا
کیا چاہتا ہے، اُس کے فیصلوں پر کسی قسم کا بھروسہ نہیں کیا
جا سکتا۔

پس بادشاہ کو دوسروں سے مشورہ ضرور کرنا چاہیے
لیکن اُس وقت جب وہ خود مشورہ کی ضرورت سمجھے نہ اُس
وقت جب دوسرے اُسے ضروری خیال کریں۔ بلا طلب
مشورہ دینے سے لوگوں کو روکنا چاہیے۔ تاہم ضرورت ہے
کہ بادشاہ برابر استفسار کیا کرے اور جوابات کو صبر کے
ساتھ سنا کرے۔ اور اگر اُسے یہ پتہ چلے کہ کسی شخص نے اُسے
سچ سچ بات نہیں بتائی ہے تو اس پر اپنے غصہ کا اظہار کرنا

چاہیے

بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ اگر کسی بادشاہ کو یہ شہرت نصیب ہو کہ وہ بڑا مصلحت اندیش ہے تو اس کی وجہ یہ نہ ہوگی کہ خود اس میں کوئی خوبی ہے بلکہ یہ کہ اس نے اپنے اردگرد عقلمند مشیر جمع کر رکھے ہیں۔ مگر یہ خیال غلط ہے۔ اس لئے کہ یہ کلیہ ایسا ہے جو کبھی غلط ثابت نہیں ہوتا اور جو زمان و مکان کی قیدسے آزاد ہے کہ جس بادشاہ میں خود عقل نہ ہوگی وہ ہمیشہ اچھے مشورے سے محروم رہے گا۔ یہ اور بات ہے کہ اتفاق سے وہ تمام کے تمام امور مملکت کسی غیر معمولی طور پر ہوشیار شخص کے سپرد کر دے۔ ایسی صورت میں اُسے ضرور اچھا مشورہ ملے گا، مگر یہ سلسلہ بہت دنوں نہیں چلے گا اس لئے کہ ایسا مشیر چند روز میں اس کو بادشاہت ہی سے محروم کر دے گا۔

لیکن اگر کوئی ناتجربہ کار بادشاہ بہت سے لوگوں سے صلاح کرے گا تو اُسے جو مشورے ملیں گے وہ نہایت بے جوڑ ہوں گے اور اُن میں ربط پیدا کرنا اس کے بس کی بات نہ ہوگی۔ ہر مشیر اپنے مفاد کو پیش نظر رکھے گا اور بادشاہ نہ تو اُن کی اصلاح کر سکے گا اور نہ اُن کو ٹھیک سے بھانپ سکے گا۔ اس میں ذرا شبہ کی گنجائش نہیں کہ

ووٹ دے کر دینے میں دریغ نہیں کریں گے۔ یہ اور بات ہے
کہ تجربہ طور پر ان کو ایمانداری پر قائم رکھا جائے۔ پس ہم یہ
کہہ سکتے ہیں کہ اچھے مشورے چاہے وہ جہاں سے آئیں۔
بادشاہ کی دانائی کا نتیجہ ہوتے ہیں، بادشاہ کی دانائی
اچھے مشوروں سے نہیں پیدا ہوتی۔

# باب ۲۴

## شاہان اطالیہ اپنی ریاستیں کیوں کھو بیٹھے؟

متذکرہ بالا تجویزوں پر اچھی طرح عمل کرنے سے نیا بادشاہ آپ حکومت کو مستقل طور پر قایم کر سکے گا۔ اس کی بادشاہت پرانی بھی ہوتی تب بھی اُسے ایسی سلامتی اور استقلال نصیب نہ ہوتا۔ اس لئے کہ خاندانی بادشاہ کے مقابلے میں نئے بادشاہ کے حرکات و سکنات کی بہت زیادہ جانچ پڑتال کی جاتی ہے۔ اگر وہ اچھے سمجھے جاتے ہیں تو لوگوں کو توڑ لینے اور گرویدہ بنانے میں یہ نسل قدامت سے کہیں زیادہ موثر ثابت ہوتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ ماضی کی نسبت حال میں زیادہ کشش ہوتی ہے اور جب لوگ حال کو خوشگوار پاتے ہیں تو اس سے پورا استفادہ کرتے ہیں اور کچھ نہیں طلب کرتے۔ یہی نہیں، وہ بادشاہ کی مدافعت میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتے بشرطیکہ اس میں دوسرے نقائص نہ ہوں۔

بس ایک نئی بادشاہت قائم کرنے پر آسے اچھے قوانین، اچھی فوجوں، اچھے صیغوں اور اپنی شان سے آراستہ و مستحکم کرنے کی وجہ سے اس کا دونا نام ہوگا، اسی طرح موروثی بادشاہ اپنی نالائقی سے بادشاہت کھو بیٹھے تو اس کی دونی رسوائی ہوگی۔

ہم اپنے زمانے کے ان رئیسوں کو غور کی نگاہ سے دیکھتے ہیں جنہوں نے اپنی ریاستیں گنوا دیں مثلاً شاہ نیپلز، ڈیوک آف ملان وغیرہ تو ان میں مندرجہ ذیل نقائص نظر آتے ہیں ایک غلطی تو سپاہ سے متعلق ہے جس کے اسباب پہلے تفصیل کے ساتھ بیان کئے جا چکے ہیں۔ دوسرے یہ کہ یا تو قوم اُن سے بدظن تھی یا اگر قوم خوش تھی تو شرفا کو وہ اپنے قابو میں نہ کر سکے۔ یہ خرابیاں نہ ہوں تو فوجوں کے ہوتے ہوئے ریاستیں مغلوب نہیں ہو سکتیں۔

فلپ مقدونی (میری مراد سکندر اعظم کے باپ سے نہیں بلکہ اس فلپ سے ہے جس کو ٹیٹس کوئن تیتس نے شکست دی) ایسے

---

[1] فریڈرک ارگھانی کے ہاتھ سے نیپلز کی حکومت سنہ ۱۵۰۱ء میں نکل گئی جب فرانسیسیوں اور ہسپانیوں نے حملہ کر دیا۔

[2] لودوی کو مورو سے ملان کی حکومت لوئی دوازدہم شاہ فرانس نے سنہ ۱۵۰۰ء میں چھینی۔

[3] دوسری مقدونی جنگ کی طرف اشارہ ہے جب فلپ پنجم شاہ مقدونیہ کو سنہ ۱۹۷ ق م میں تیتس نے شکست دی۔

وسیع علاقوں کا مالک نہیں تھا کہ اس کا مقابلہ اس پر حملہ کرنے
والوں یعنی اہل روما اور یونان سے کیا جا سکے مگر آدمی جنگجو تھا
قوم کو اپنی طرف کھینچنا اور شرفا کو اپنے ساتھ ملانا جانتا تھا
چنانچہ اس نے کئی سال تک اپنے دشمنوں کے خلاف جنگ
جاری رکھی[1] اور گو آخیر میں تمام شہر اس سے چھن گئے مگر اس
کی بادشاہت برقرار رہی۔

پس اگر ایک عرصے کی حکومت کے بعد ہمارے بادشاہوں
کے ہاتھ سے ان کی ریاستیں نکل گئیں تو اس کے لئے بدقسمتی کی
شکایت بے جا ہے۔ اس کی ذمہ دار خود ان کی کاہلی ہے۔ اس
لئے کہ امن کے زمانہ میں انہیں یہ بات کبھی نہ سوجھی کہ تغیرات بھی
ممکن ہیں۔ (انسانوں میں یہ عیب بہت عام ہے کہ کامل سکون ہو تو
طوفانوں کا خیال نہیں آتا) چنانچہ جب برا وقت آیا تو ان
بادشاہوں کو بجائے مدافعت کرنے کے بھاگنے کی سوجھی۔ اُن کا
خیال تھا کہ قوم فاتح کی حرکتوں سے تنگ آ کر انہیں واپس
بلا لے گی۔ یہ رویہ اس صورت میں مناسب ہو سکتا ہے جب
اور سب تدبیریں بیکار ثابت ہو چکی ہوں۔ مگر یہ بہت بے معنی
بات ہے کہ اس پر بھروسہ کر کے اور کسی قسم کے انتظامات کئے
ہی نہ جائیں۔ کون ہے جس کے دل میں اس خیال سے گرنے

---

[1] سنہ [illegible] سے سنہ ۱۹۰ ق۔ م۔ تک۔

کی خواہش پیدا ہو کر کوئی نہ کوئی اسے انتہا کر کمزرا کر دے گا۔ اولاً تو یہ ضروری نہیں کہ قوم بادشاہ کو بحال کر دے۔ اور اگر یہ ہو بھی تو اس میں بچاؤ کی صورت نہیں، اس لئے کہ وہ نجات کس کام کی جو خود اپنے زورِ بازو سے حاصل نہ ہوئی ہو۔ حفاظت کے وہی طریقے قابلِ اعتبار، یقینی اور دیرپا ہوتے ہیں جن کا دارومدار خود اپنی ذات اور اپنی طاقت پر ہو۔

# باب ۲۵

## انسانی معاملات میں قسمت کو کتنا دخل ہے اور اس کی کیونکر مخالفت کی جاسکتی ہے؟

میں اس سے ناواقف نہیں کہ بہت سے لوگ ایسے تھے ہیں اور اب بھی ہیں جن کی رائے ہیں دنیا کے تمام امور کچھ اس طرح قسمت اور خدا کی مرضی کے تابع ہیں کہ ان میں انسان اپنی عقل سے کسی قسم کا رد و بدل نہیں کر سکتا اور وہ اس میں بالکل لاچار ہے۔ اس سبب سے یہ لوگ ہمیں یقین دلانے کی کوشش کرتے ہیں کہ انسانی سعی بے سود ہے اور ہر کام کو قسمت پر چھوڑ دینا چاہیے۔ اس رائے کو ہمارے زمانہ میں اور بھی تقویت پہنچی ہے، وہ اس وجہ سے کہ حال میں اتنے بڑے بڑے تغیرات واقع ہوئے ہیں اور اب بھی تک ہو رہے ہیں کہ جن کا سان و گمان بھی نہ تھا۔ کبھی کبھی ان پر غور کرتا ہوں تو ایک حد تک میں بھی اس رائے کی طرف مائل ہو جاتا ہوں۔ مگر یہ

خیال میں انسانی ارادہ کو اس طرح مسترد نہیں کیا جا سکتا ہے۔ انسانی اعمال میں سے نصف تو ایسے ہیں جن میں خود قسمت کارفرما ہے۔ باقی بچے نصف یا نصف سے کچھ کم سو وہ قسمت انسان پر چھوڑ دیتی ہے۔

قسمت کو میں ایک ایسی تیز و تند ندی کے مانند سمجھتا ہوں جس میں سیلاب آتا ہے تو چاروں طرف میدانوں میں پانی ہی پانی نظر آتا ہے اور ندی ہے کہ درختوں کو جڑ سے اکھاڑتی، مکانوں کو گراتی، اور زمین کاٹتی چلی جاتی ہے۔ کوئی اس کے سامنے نہیں ٹھہر پاتا اور اس کے غیظ و غضب کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہی بنتی ہے۔ اس کا مقابلہ کسی طرح ممکن نہیں ہوتا۔

یہ سب درست سہی، مگر اس کے یہ معنی تو نہیں کہ چونکہ دریا کی فطرت کا یہی تقاضا ہے اس لئے جب اچھا موسم چلے تب بھی لوگ کوئی تدبیر نہ کریں، نہ بند تیار کرائیں، نہ نہریں بنوائیں، تاکہ جب ندی پھر چڑھنے لگے تو اس کا پانی نہروں میں سے ہو کر نکل جائے اور اس کا زور پہلے کی مانند غیر محدود اور خطرناک نہ ہونے پائے۔ یہی حال قسمت کا ہے۔ وہ اپنا زور وہیں دکھاتی ہے جہاں اسے معلوم ہوتا ہے کہ مقابلہ کرنے کے لئے کوئی انتظام نہیں کیا گیا ہے۔ جہاں اسے روکنے کے لئے بند اور نہریں نہیں ہوتیں وہاں وہ بھی دریا کی طرح

زور آزمائی کرتی ہے۔

اب اگر ملک اطالیہ پر نظر ڈال جائے جوان تغیرات کا مرکز اور محرک ہے تو معلوم ہوگا کہ یہ ایک کھلے میدان کی مانند ہے جس میں نہ کوئی بند ہے نہ کوئی پشتہ۔ جرمنی، ہسپانیہ اور فرانس کی مانند اگر یہاں بھی حفاظت کی تدبیریں کی جائیں تو اس حملہ سے اتنی بڑی بڑی تبدیلیاں نہ ہوتیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ یورش ہی نہ ہوتی۔ قسمت سے مقابلہ کرنے کے بارے میں میں نے جو عام اصول اوپر بیان کئے اسی پر اکتفا کرتا ہوں، باقی رہے جزویات سوان کے بارے میں خاص طور پر ایک بات کہنا ہے۔ ہم اکثر دیکھتے ہیں کہ آج جو بادشاہ بامراد معلوم ہوتا ہے کل تباہ و برباد ہو جاتا ہے۔ حالانکہ اس کے مزاج یا سیرت میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہوتی۔ یہ میرے خیال میں ان اسباب کی بنا پر واقع ہوتا ہے جو پہلے مفصل طور پر بیان کئے جا چکے ہیں۔ یعنی یہ کہ جو بادشاہ صرف قسمت پر بھروسہ کرے۔ وہ قسمت پلٹنے کی صورت میں کیسے تباہ نہ ہو۔ میں یہ بھی سمجھتا ہوں کہ وہ بادشاہ بہت کامیاب ہوتے ہیں جو اپنے افعال کو زمانے کے مزاج کے مطابق ڈھال سکیں۔ جو کوئی زمانہ کے مزاج کا خیال نہیں رکھتا وہ ناکام رہتا ہے۔ اس لئے کہ مقصد تو سب کا ایک ہی ہوتا ہے یعنی

ناموری و دولت۔ مگر مختلف، لوگ اسے مختلف طریقوں سے حاصل کرتے ہیں۔ ایک احتیاط برتتا ہے، ایک جلد بازی کرتا ہے۔ ایک قوت سے کام نکالتا ہے، ایک ہنرمندی سے، ایک صابر ہوتا ہے، ایک بے صبر۔ یہ سب اپنا مقصد حاصل کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں مگر حصول مقصد کے طریقوں میں اختلاف ہوتا ہے۔ کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ دو محتاط افراد میں سے ایک کو کامیابی ہوتی ہے اور دوسرے کو ناکامی اسی طرح یہ بھی کہ دو شخص دو مختلف طریقوں سے یکساں طور پر کامیاب ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک احتیاط سے اور دوسرا جلد بازی سے۔ یہ سب اس پر موقوف ہے کہ حصول مقصد کا طریقہ زمانہ کے مزاج سے مطابقت رکھتا ہے یا نہیں۔ یہی سبب ہے جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں کہ گو دو شخص دو مختلف طریقے اختیار کرتے ہیں، مگر ایک ہی نتیجہ برآمد ہوتا ہے، اور دو افراد ایک ہی طریقہ پر عمل پیرا ہوتے ہیں، مگر ان میں سے ایک کو اپنے مقصد میں کامیابی ہوتی ہے اور دوسرے کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔ قسمت کے تغیر کی بنیاد بھی اسی پر ہے۔ ان لوگوں کو لیجئے جو احتیاط اور صبر سے کام لیتے ہیں۔ اگر زمانہ اور ماحول کا یہی تقاضہ ہوگا کہ وہ احتیاط برتیں تو انھیں فروغ اور کامیابی نصیب ہوگی۔ لیکن زمانہ اور ہوا کا رخ بدلنے

کی صورت میں اگر وہ اپنا طریق کار نہ بدلیں گے تو ان کی خیریت نہ ہوگی۔ مگر دقت یہ ہے کہ عموماً انسان ایسا چوکس نہیں ہوتا کہ زمانہ کے ساتھ خود بھی بدلے۔ ایک تو جو اس کی طبیعت کا رجحان ہے اس سے ہٹنا سہل کام نہیں اور دوسرے جو شخص ہمیشہ ایک ہی راستہ پر چلنے سے فائدہ اٹھاتا رہا ہے۔ لسے آسانی سے یہ یقین کیسے آئے کہ اس راہ کو چھوڑنے ہی میں اس کا فائدہ ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب جوکھوں میں پڑنے کا وقت ہو تب بھی محتاط شخص سے یہ نہیں بن پڑتا اور وہ یوں تباہ و برباد ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر وہ زمانہ کے تغیر کے ساتھ خود بھی بدل جاتا تو اس کی قسمت نہیں بدلتی۔

پوپ جولیس دوم کے تمام کاموں سے بے چینی عیاں ہے۔ زمانہ اور حالات کا بھی یہی تقاضا تھا کہ وہ آندھی کی چال چلے چنانچہ وہ ہمیشہ کامیاب ہوتا رہا۔ بلونا کے خلاف اس کی پہلی مہم پر نظر ڈالیے۔ میسر ژیووانی بنتی وولی ابھی زندہ تھا۔ اہل وینس مہم کے طرفدار نہ تھے، یہی حال شاہ ہسپانیہ کا تھا۔ شاہ فرانس سے اس موضوع پر گفت وشنید کا سلسلہ ابھی جاری تھا، ان سب باتوں کے باوجود حسب معمول جوانمردی اور سرگرمی کے ساتھ میدان میں کود پڑا۔ اس

---

لہ ۱۵۰۶ء

کے اس اقدام پر ہسپانیہ اور اہل وینس خاموش رہے۔ اہل وینس خوف کی وجہ سے اور ہسپانیہ اس وجہ سے کہ اُسے تمام قلمروئے نیپلس کو دوبارہ فتح کرنے کی آرزو تھی۔[1] برخلاف اس کے وہ شاہِ فرانس کو اپنے ساتھ ملا سکا، اس لئے کہ وہ بادشاہ اس اقدام کو دیکھ چکا تھا، اور اہل وینس کو نیچا دکھانے کے لئے پوپ سے دوستی پیدا کرنا چاہتا تھا۔[2] پھر اس کو کھلم کھلا ناراض کئے بغیر وہ کیسے اُسے فوج دینے سے انکار کرتا۔ چنانچہ جولیس نے اپنی جلد بازی سے وہ وہ کام انجام دئیے جو دوسرا پوپ محض دانائی سے کبھی نہ انجام دے سکتا تھا۔ اس لئے کہ اگر وہ روما میں اس وقت تک نہ بیٹھا رہتا جب تک کہ تمام شرائط طے اور سب انتظامات مکمل نہ ہو جاتے اور کوئی دوسرا پوپ ہوتا تو یہی کرتا، تو اسے کبھی بھی کامیابی نصیب نہ ہوتی۔ اس لئے کہ شاہ فرانس طرح طرح کے حیلے بہانے کرتا اور دوسرے بادشاہ ہزار قسم کا خوف دلاتے۔ اس کے اور کاموں کا میں ذکر نہیں کرتا اس لئے کہ وہ سب ایک سے تھے۔ اور ان سب میں اُسے کامیابی ہوتی رہی۔ عمر اس نے چھوٹی پائی اس وجہ سے ناکامی سے واسطہ نہیں

---

[1] ساحل کے ایک حصہ پر ۱۴۹۶ء سے اہل وینس کا قبضہ تھا۔ جو ۱۵۰۹ء تک قائم رہا۔

[2] ۱۵۰۸ء میں یہ اتحاد کمبرائی کی لیگ کی شکل میں معرض وجود میں آیا۔

پڑا۔ لیکن اگر حالات ایسے پیدا ہو جاتے کہ احتیاط کا برتنا ضروری ہوتا تو اس کی تباہی لازمی تھی، اس لئے کہ وہ اس طریق عمل کو کیسے خیرباد کہتا جس کی طرف اس کا فطرتی طور پر میلان تھا۔

مختصر یہ ہے کہ قسمت تغیر پذیر واقع ہوئی ہے اور انسان غیر متبدل۔ کامیابی اس وقت تک ہوتی ہے۔ جبتک دونوں میں مطابقت رہے، اور جہاں دونوں میں تناقض ہوا پھر ناکامی ہی ناکامی ہے۔ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ احتیاط کرنے سے جان جوکھوں میں ڈالنا بہتر ہے۔ اس لئے کہ قسمت کو بس عورت سمجھئے۔ اُسے قابو میں رکھنا مقصود ہو تو ضروری ہے کہ اس کی زد وکوب کی جائے اور اس کے ساتھ سلوک میں سختی برتی جائے۔ اکثر یہی دیکھا جاتا ہے کہ جو لوگ یہ رویہ اختیار کرتے ہیں وہ اس پر حاوی ہو جاتے ہیں۔ شرم و لحاظ سے کام نہیں چلتا۔ پس عورت کی طرح قسمت بھی نوجوانوں پر شیدا ہے۔ اس لئے کہ ان میں احتیاط کا مادہ کم ہوتا ہے تندی و تیزی زیادہ ہوتی ہے اور وہ زیادہ بے باکی کے ساتھ اس پر حکومت کرتے ہیں۔

# باب ۲۶

## اطالیہ کو وحشیوں سے آزاد کراؤ

اب تک جو کچھ کہا گیا ہے اس پر جب میں نے خوب غور کیا
اور دل ہی دل میں سوچا کہ یہ گھڑی نئے بادشاہ کے لئے مبارک
ہے یا نامبارک اور عقلمند اور نیک بادشاہ کے لئے اس کا موقع
ہے یا نہیں کہ کسی نئے نظام کی بنا ڈال سکے جس سے اس کی بھی
عزت بڑھے اور اس ملک کے باشندوں کا بھی بھلا ہو۔ تو میں اس
نتیجہ پر پہنچا کہ آج کل کتنی ہی باتیں نئے بادشاہ کے حق میں ہیں اس
لحاظ سے شاید کبھی کوئی زمانہ موجودہ زمانہ سے زیادہ موزوں گزرا ہو۔
اور جیسا کہ میں نے پہلے کہا حضرت موسیٰ کی قابلیت کے اظہار
کے لئے بنی اسرائیل کا اہل مصر کی غلامی میں گرفتار ہونا اور سائرس
کی روحانی عظمت کا پتہ لگانے کے لئے اہل فارس پر میدیوں کا
جور و ستم ہونا اور تھیسیوس کی صلاحیتوں کو منظر عام پر لانے

کے لئے اہل اثینینہ کا منتشر ہونا ضروری تھا تو پھر کسی اطالوی کی خوبی آشکارا
ہونے کی صورت یہی تھی کہ اطالیہ بے طرح مصیبتوں کا شکار ہو جیسا کہ اب
ہے، اور وہاں کے باشندے یہودیوں سے بدتر غلام، اہل فارس سے
بڑھ کر مظلوم اور اہل اثینیہ سے زیادہ
ہوں۔ نہ ان کا کوئی سردار ہو، نہ وہاں کسی قسم کا نظام اس پر بُری طرح مار
پڑے، اُسے خوب لوٹا جائے، اس کے ٹکڑے ٹکڑے کئے جائیں، وہ ایک
سرے سے دوسرے سرے تک تاخت و تاراج کیا جائے، اور اُسے
ہر قسم کی مصیبت سہنا پڑے۔

حال میں بعض افراد ایسے ہوئے جن کے انداز سے یہ شبہ ہو چلا
تھا کہ شاید خدا نے انہیں ہماری نجات کے لئے متعین کیا ہے[1]۔ مگر بعد میں
جب وہ اپنے انتہائی عروج کو پہنچے تو قسمت نے ٹھکرا دیا۔ اب صورت
یہ ہے کہ اطالیہ کے جسم میں جیسے جان ہو ہی نہیں۔ وہ اس کا منتظر ہے
کہ کوئی آئے۔ اس کے مرض کا علاج کرے، لمبارڈی کی تباہی اور لوٹ
کھسوٹ کو بند کرے۔ تسکانی کی دھوکہ بازیوں اور زیادتیوں کا خاتمہ کرے
اور ان زخموں کی مرہم پٹی کرے جو مدتوں سے سڑ رہے ہیں۔ وہ کس طرح
خدا سے التجا کر رہا ہے کہ اسے مالک تو کسی ایسے شخص کو بھیج جو ان مصیبتوں
اور وحشیانہ جور و ستم سے چھٹکارا دلائے۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ
ایک جھنڈے تلے جمع ہونے پر آمادہ اور راضی ہے بشرطیکہ کوئی جھنڈا

---

[1] مراد ہے غالباً سیزارے بورجیا۔

بلند کرنے والا ہو۔ میں بزار نظر دوڑاتا ہوں مگر سوائے آپ کے عالی مرتبہ
خاندان کے اجو اپنے اوصاف حمیدہ اور اقبال مندی کی وجہ سے
ممتاز ہے، جس سے خدا خوش اور جس پر کلیسا مہربان ہے اور جسے اس
وقت کلیسا کی قیادت کا شرف حاصل ہے) اور کوئی نجات دہندہ
دکھائی نہیں پڑتا۔ یہ کام کچھ بہت کٹھن بھی نہیں ہے، آپ ذرا ان لوگوں
کے کارناموں اور زندگیوں پر نظر ڈالیں جن کا میں نے ذکر کیا ہے
یہ ضروری ہے کہ وہ بہت عظیم الشان اور غیر معمولی انسان تھے، مگر
تھے تو انسان ہی۔ انھیں جیسے مواقع ملے ویسے مواقع آج بھی ہیں۔ اُن
کی مہمیں نہ تو موجودہ مہم سے زیادہ نیک تھیں اور نہ زیادہ سہل۔ خدا
بھی آپ سے زیادہ اُن پر مہربان نہ تھا۔

ہمارا مقصد انصاف پر مبنی ہے اس لئے کہ جو جنگ ضروری ہو
اُس کی بنا ر انصاف پر ہے۔ اور جن اسلحہ سے ساری امیدیں
وابستہ ہوں وہ متبرک ہیں۔ آج پوری قوم اس مہم میں شریک ہونے
کے لئے بے تاب ہے۔ اور جب بے تابی کا یہ عالم ہو تو زیادہ مشکلات
نہیں پیش آسکتیں۔ شرط اتنی ہے کہ آپ ان لوگوں کے نقش قدم پر
چلیں جن کو میں نے آپ کے سامنے بطور نمونہ کے پیش کیا ہے۔ اس
وقت آپ پر خدا کے الطاف و کرم کی کتنی صاف نشانیاں نظر آرہی
ہیں۔ سمندر دو حصوں میں تقسیم ہو گیا ہے۔ بادل کا ایک ٹکڑا رستہ

---

عطا کرنے والا ہو گیا۔ لورنزو کا دوسرا بیٹا ۱۵۱۳ء سے ۱۵۲۱ء تک دہم کے نام سے پاپائے روما

دکھاتا چلا گیا ہے، چٹانوں سے پانی پھوٹ پڑا، من و سلویٰ کی بارش ہوئی
ہے۔ غرض ہر چیز آپ کا رتبہ بڑھانے میں مد معلوم ہوتی ہے۔ باقی جو کچھ ہے
وہ خود آپ کے کرنے کا ہے۔ خدا خود کاموں کو تکمیل تک نہیں پہنچایا کرتا
اس لئے کہ گوارا دے سکی آزادی سے اور حصول ناموری میں شرکت سے محروم
نہیں کرنا چاہتا۔

یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ جن اطالیوں کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے
ان میں کوئی بھی وہ کام انجام نہ دے سکا جس کی آپ کے خاندان
ذی شان سے توقع کی جاتی ہے۔ اطالیہ میں جو انقلاب ہوئے اور جو
جنگیں لڑی گئیں ان سے اگر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سپاہیانہ
اوصاف اس ملک سے رخصت ہو چکے ہیں تو اس کی وجہ یہ تھی کہ قدیم نظام
اچھا نہ تھا اور ہم میں سے کسی کو یہ معلوم نہ تھا کہ اس کی جگہ کون سا نیا نظام قائم
کیا جائے جب کوئی شخص نیا نیا بادشاہ ہو تو کسی چیز سے اس کے مرتبہ میں اتنا
اضافہ نہیں ہوتا جتنا کہ نئے قوانین جاری کرنے اور نئے ادارے قائم
کرنے سے۔ ان چیزوں سے بشرطیکہ ان کی بنیادیں مستحکم ہوں اور ان میں
خاصہ وزن ہو، بادشاہ کی تعریف و تحسین ہوتی ہے اور اس کا وقار
بڑھتا ہے۔ اور اطالیہ میں ہر طرح کی اصلاح کے لئے مواقع کی کمی نہیں
یہاں کے لوگوں میں جسمانی قوت کی نہیں، دماغی قوت کی کمی ہے۔
ذرا کسی مبارزہ یا دست بدست لڑائی پر نظر ڈالئے۔ قوت، سبکدستی
اور پھرتی میں اہل اطالیہ دوسروں سے کتنے بڑھے ہوئے ہیں۔

لیکن ان کی فوجیں نکمی ہیں اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ رہبروں کی کمی ہے، جو واقعی لائق ہیں اُن کی کوئی سنوائی نہیں ہے، اور کوئی اپنے تئیں نہ معلوم کیا سمجھتا ہے اس لئے کہ اس سے پہلے بہت ممتاز رہبر ہونے ہی نہیں ہیں یہی وجہ ہے کہ گزشتہ بیس[1] سال کے جنگ وجدل کے دوران میں جب کبھی کوئی فوج صرف اطالیوں پر مشتمل تھی بالکل ناکام ثابت ہوئی۔ اس کا پہلا ثبوت ال تارو[2] میں ملتا ہے۔ پھر الے ساندریہ[3]، کاپوا[4]، جنوا[5]، وائیلا[6]، بلونا[7] اور مشتری[8] میں۔

پس اگر آپ کا عالی مرتبہ خاندان غیر معمولی افراد کے نقش قدم پر چلنا چاہتا ہے جو اپنے ملک کی نجات کا باعث ہوئے تو سب سے پہلی ضرورت یہ ہے کہ آپ کی اپنی فوج ہو کیونکہ یہی ہر بڑے کام کی صحیح بنیاد ہے۔ اس لئے کہ اپنی فوج غیر فوج سے لازمی

---

[1] یعنی چارلس ہشتم کی اطالوی مہم (۱۴۹۴ء) کے بعد سے۔
[2] ۱۴۹۵ء جب فرانسیسیوں کو وینس کی لیگ پر فتح حاصل کی۔
[3] ۱۴۹۹ء الے ساندریہ کی تباہی لوئی دوازدہم کے ہاتھوں۔
[4] ۱۵۰۱ء جب فرانسیسیوں نے بورجیا کے ساتھ جنگ کر کے کاپوا پر قبضہ کیا۔
[5] ۱۵۰۷ء لوئی دوازدہم کا جنوا پر قبضہ۔
[6] ۱۵۰۹ء لوئی دوازدہم کی فتح اہل وینس پر۔
[7] ۱۵۱۱ء فرانس کی جنگ پوپ اور اہل وینس کی متحدہ طاقت سے۔
[8] ۱۵۱۳ء اس جنگ کی طرف اشارہ ہے جو اہل وینس اور لیگ (پوپ، شہنشاہ ہسپانیہ اور رومائی لانتز) کے مابین ہوئی۔

طور پر زیادہ وفادار، زیادہ قابل اعتبار اور بہتر ہوگی۔ اور اگر فرداً فرداً آپ کے سپاہی اچھے ہوں گے تو مجموعی طور پر اور بھی اچھے ہوں گے خصوصاً جب وہ دیکھیں گے کہ وہ خود بادشاہ کے زیر کمان ہیں، بادشاہ ان کی عزت کرتا ہے اور اپنے پاس سے ان کا خرچ دیتا ہے، لہذا اس طرح کی فوج تیار کرنا ضروری ہے تاکہ آپ کی مدافعت میں اطالوی شجاعت بدیسیوں کا مقابلہ کرسکے۔

کوہستانی اور ہسپانوی پیادہ افواج ایسی ہیں کہ ان کا مقابلہ بہت مشکل خیال کیا جاتا ہے مگر دونوں میں ایک خرابی ہے جس کی وجہ سے اور فوج نہ صرف ان کا مقابلہ کرسکتی ہے بلکہ انہیں نیچا دکھا سکتی ہے۔ ہسپانوی فوجیں رسالے کے مقابلہ کی تاب نہیں لا سکتیں اور اگر دست بدست جنگ کی نوبت آجائے تو کوہستانی فوجیں پلٹنوں سے بہت ڈرتی ہیں۔ گو دوسرے دعوے کا پورا ثبوت نہیں دیا جا سکتا، لیکن اس کی سچائی کا تھوڑا بہت اندازہ جنگ راوینہ[1] سے ہو سکتا ہے، جہاں ہسپانوی پیادہ فوج کا مقابلہ جرمن دستوں سے ہوا اور جن کی تدابیر جنگ وہی تھیں جو کوہستانیوں کی ہوتی ہیں۔ جب ہسپانوی سپاہی جسم کی پھرتی اور اپنے سپروں کی مدد سے ایک دفعہ جرمنوں کے نیزوں کی زد سے بچ کر نکل گئے تو پھر نئے سرے سے حملہ آور ہوئے اور جرمن نکمے کر کے بکھر گئے، اگر سوار فوج بہت تیزی سے موقع پر نہ آن دھمکتی تو جرمنوں کا خاتمہ تھا۔ ہم چونکہ ان دونوں پیادہ فوجوں کے نقائص کا پتہ ہے لہذا

---

[1] ۱۵۱۲ء

اس کا امکان ہے کہ ایک نئی قسم کی فوج تیار کریں جو رسالوں کا مقابلہ بھی کر سکے اور پیادہ فوج سے بھی خائف نہ ہو۔ یہ ضروری نہیں کہ ہم ایک بالکل نئے انداز کی فوج ایجاد کریں۔ پرانے انداز کی فوجوں میں صرف تھوڑی سی تبدیلی کرنی ہوگی۔ اور یہی اصلاحیں ہیں جن سے نئے بادشاہ کا نام روشن ہو اور اس کی طاقت میں اضافہ ہوگا۔

لہٰذا اس موقعہ کو ہاتھ سے نہ نکلنے دینا چاہئے۔ چاہئے کہ اطالیہ اپنی رہائی دلانے والے کا بالآخر درشن کرے۔ اس وقت جو کیفیت ہوگی اس کا نقشہ الفاظ کھینچنے سے قاصر ہیں۔ جہاں بیرونی سیل ریل پیل رہی ہے وہاں اس کا کس شوق سے خیر مقدم ہوگا۔ کس شدت کے ساتھ انتقام کی آگ بھڑکے گی۔ کیسا محکم یقین ہوگا۔ کیسی جاں نثاری ہوگی اور آنسو ہوں گے کہ بس ابلتے چلے آئیں گے۔ کون ہے جو اس کے لئے اپنا دروازہ نہ کھولے گا؟ کس کو اس کی اطاعت سے گریز کی مجال ہوگی؟ کس کا حسد اس کی راہ میں حائل ہو سکے گا؟ اطالیہ کا کون ایسا فرزند ہوگا جو اس کے سامنے سر تسلیم نہ خم کرے گا؟ اس وحشیانہ جور و ستم کی بدبو ایسی ہے کہ سب کے نتھنے پھٹے جاتے ہیں۔ یہ نیک کام آپ ہی کے نامی خاندان کے کرنے کا ہے۔ ہمت کیجئے اور امید کو ہاتھ سے نہ جانے دیجئے۔ یہاں تک کہ آپ کے جھنڈے تلے اس ملک کے پھلیں پھولیں اور آپ کے زیر سرپرستی پٹرارک کا یہ قول پورا ہو ـــــ

جس گھڑی مردانگی نے ہاتھ میں تلوار لی ۔۔۔ وحشیانِ خیرہ سر ڈھونڈنے نہ پائیں گے ظفر
عہد پارینہ کے جنگی کارناموں کے سبب ۔۔۔ آج بھی اٹلی کے سینے میں فروزاں ہیں شرر